www.naushahidynasty.com

باب 4

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی پنجابی شاعری

فنی مطالعہ

اسلوب کسے کہتے ہیں

ہر انسان کے بات کہنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اسی انداز کی وجہ سے ہم اسکی آواز دور سے سن کر بن دیکھے اُسے پہچان لیتے ہیں۔ یہی کلیہ تحریر پر صادق آتا ہے۔ ہر ادیب کا اندازِ تحریر اُسے اپنے ہم عصر اور ماقبل ادباء سے مختلف و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ شاید اسی لئے نیومن نے کہا تھا۔

"Every spirit builds its own house" (1)

بظاہر تو اسی کو اسلوب سمجھا جاتا ہے لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اسلوب کی اصطلاح اپنے اندر وسیع مطالب و مفاہیم کا سمندر لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ نقادوں کے نزدیک اسلوب، تکنیک، ہئیت، زبان اور بیان کی تمام صورتوں پر حاوی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی رائے ہے:

> "اس میں موضوع انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص، طرز فکر اور تاثیر سبھی منزلیں آتی ہیں۔ تاثیر سے لے کر اظہار تک ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر دیجئے، انداز بیان کی نشو ونما اور ترتیب کا شیرازہ بکھر جائیگا۔ یہی مفہوم اور طرز بیان نفس مضمون اور اسٹائل کا سنگم ہے۔" (2)

1- Hadsin: An Introdution to the Study of Literature. P-28

2- ڈاکٹر محمد حسن: ادبی تنقید؛ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ 1954ء ص 19

جہاں تک ادبی خلوص کا تعلق ہے، وہ ہر شاعر اور ادیب کے پاس ہوتا ہے لیکن طرز فکر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ادیب کا اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے ، اشیاء کا مشاہدہ کرنے، پرکھنے اور پھر احساس کو دوسروں تک پہنچانے کا ڈھنگ مختلف ہوتا ہے۔ ادب میں یہی خصائص ایک فنکار کے اسلوب کو دوسرے فنکار کے اسلوب سے جدا کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اسلوب کو Style کہتے ہیں۔ شاعر کے اسلوب بیان کو Poetic Style کا نام دیا جاتا ہے اور نثر نگار کے اسلوب نگارش کو Prose Style کہتے ہیں۔ سٹائل یا اسلوب کی بحث چھیڑنے سے قبل اسکی باریکیوں پر غور کرنا بے حد ضروری ہے۔ سٹائل کیا ہے؟ اس کے متعلق مختلف لوگوں کے مختلف اقوال و نظریات ہیں۔ اس سلسلے میں معروف لکھاری Joseph T. Shipley کہتا ہے:

> "Style is a term of literary criticism, vievwed as specific by some and as generic by others, used to name or discribe the manners as quality of an expresson"(1)

Pater کے خیال میں سٹائل سے مراد:

> "The finer accommodation of Speech to the vision within"(2)

آرنلڈ نے سٹائل کی وضاحت کے لئے Words worth کی شاعری کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

> "When Wordsworth has style, Nature hersef seems ..... to take the Pen out of his hand to write for him with her own bare, sheer penetrating powers."(3)

1- Joseph, T. Shipley: Dictionary of world Literary Terms, Britain 1970 P.314

2- Ibid

3- Ibid

اس ضمن میں کسی حد تک Stenddal کی رائے وزنی معلوم ہوتی ہے:

"Style consists in adding to a given thought all the circumstances calculated to produce the whole effect that the thought ought to produce"(1)

شوپنہار کے نزدیک سٹائل ذہن کا چہرہ مہرہ ہے:

"The Style is the Physiognomy of the mind"(2)

نیومن نے بھی ایسی ہی بات کہی ہے:

"Style is a thinking out into language." (3)

ہڈسن نے سٹائل کی تعریف نہایت خوبصورت اور واضح انداز میں یوں کی ہے:

"The chose of the words, the turn of the phrases the structure of the sentences their peculiar rythm and candance these are all curiously instinct with the individuality."(4)

ہڈسن کی اس تعریف سے اسلوب کے کئی عناصر سامنے آتے ہیں لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کے تین عناصر بیان کرتے ہیں:

(i) پیرائیہ بیان Technique of Expression یعنی افکار و خیالات کو پیش کرنے کا ڈھنگ جو کسی ملک میں مروج ہو۔

(ii) انفرادیت Indeviduality یعنی وہ انفرادی خصوصیات جو ہر شخص کے پیرائیہ بیان کو دوسروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔(5)

1- Dictionary of world Literary Terms P.314

2- Ibid

3- Ibid

4- An Introduction to the Study of Literature - P.27

5- ڈاکٹر سید عبداللہ: اشاراتِ تنقید، مکتبہ خیابان ادب لاہور 1966ء ص 371

(iii) عظیم الشان اور لا جواب پہلوئے بیان:

Absoluteness and Uniqueness of Style

یعنی پیرائیہ بیان کے وہ عظیم الشان پہلو جن سے امتیاز مطلق قائم ہوتا ہے۔ یعنی ایسی خصوصیات جن کا جواب ناممکن ہوتا ہے۔ (1)

اسلوب اور شخصیت

عام طور پر مذکورہ تینوں خوبیوں میں سے کسی ایک خوبی کی موجودگی کو بھی سٹائل کا نام دے دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلوب یا سٹائل اس قدر چھوٹا لفظ نہیں ہے کہ تین خوبیوں کی بجائے کسی ایک خوبی پر اس کا اطلاق کر دیا جائے۔ یا کسی ایک خوبی کو دیکھ کر اُسے سٹائل کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً سٹائل اُسے کہتے ہیں کہ جس میں فنکار کے فن میں خارجی عناصر کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر بھی شامل ہوں۔ یعنی سٹائل میں بیان کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی فن پارے کے ذریعے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے تو اُسکی روح یا تاثیر کو جلا بخشنے والی کیفیت اصل میں فنکار کی داخلی کیفیت ہوتی ہے اسی خوبی کو مشہور فرانسیسی مفکر بوفاں نے Style is the man himself کہا ہے۔ (2)

انسائیکلو پیڈیا آف برٹینکا میں سٹائل یا اسلوب کی تعریف نہایت دلچسپ انداز میں کی گئی ہے:

> "Style involves the selection and organization of the features of language for expressive effects, and Includes all uses of sound patterns, words, figures of speach, images and syntactic forms." (3)

1- سید عبداللہ ڈاکٹر: اشارات تنقید؛ مکتبہ خیابان ادب لاہور 1966ء ص 371

2- Dictionary of world Literatry Terms P.315

3- Encyclopaedia of Britannica. Vol 21 , P. 332

سٹائل یا اسلوب کے متعلق اگر ان تمام تعریفوں کا جائزہ لیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلوب کسی فن پارے کو پیش کرنے کا وہ سلیقہ ہے جس میں خارجی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مصنف کی باطنی شخصیت کا پرتو بھی ہوتا ہے۔ یوں فن کا رشتہ ایک طرف مصنف کی ذہنی کیفیت (انفرادی شخصیت) کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور دوسری طرف فن کی تمام اقدار اور روایات اُسے عظیم فن پارہ بناتی ہیں۔ یہ ادبی رویے ہی دراصل ادیب کی سوچ کو نکھارنے کا سبب بنتے ہیں۔ اور یہ تمام خوبیاں مل کر ہی اُس کے اسلوب کو جنم دیتی ہیں۔ اشیاء کو پرکھنے اور محسوس کرنے کی کیفیت تمام ادیبوں کے پاس یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر ادیب کے بیان کرنے کی کیفیت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ادیب کا اسلوب دوسرے ادیب سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ادیب کی تحریر میں الفاظ کے استعمال کا رنگ ڈھنگ جداگانہ ہوتا ہے۔ ادیب کی کامیابی کا انحصار داخلی، خارجی عناصر اور ادبی روایات کے پس منظر کے ساتھ الفاظ کے استعمال کے ایسے انداز پر ہوتا ہے جس سے ادیب اپنے وہ تاثرات دوسروں تک پہنچا سکے جو دوران مطالعہ خود اُس پر طاری ہوئے تھے۔ یعنی پڑھنے والا بھی فن پارے کو پڑھتے ہوئے اُن ہی کیفیات میں سے گزرے جن سے ادیب گزرا تھا اور قاری کی نگاہوں کے سامنے وہی تصویر گھوم جائے جو ادیب نے دیکھی تھی اور جسے وہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہی دراصل کسی ادیب کا منفرد سٹائل ہوتا ہے۔

نوشہ گنج بخشؒ کا اسلوب

ہر ادیب اپنی تحریر میں اپنے خیالات و جذبات کو بیان کرنے کے لئے اپنے مزاج کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کے ذریعے جہاں ادیب کے مزاج کا پتا چلتا ہے وہاں اُسکی سوچ اور محسوس کرنے والی کیفیت کے ساتھ ساتھ

اُس کے علاقے کی زبان، روزمرہ اور محاورے کا بھی سراغ ملتا ہے۔ کیونکہ کسی فن پارہ میں ادیب کے مزاج اور اسکی ظاہری اور باطنی شخصیت کا عکس ضرور موجود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اُس کے عہد کی زبان بھی مکمل تناظر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اُن کی عظیم شخصیت کا صوفیانہ پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی شاعری کا اچھوتا اور منفرد اسلوب بیان ہماری توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ اس منفرد اسلوب بیان کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے ہم عصر بلکہ اپنے سے قبل کے صوفی شعراء سے بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ان کی انفرادیت کا باعث ہے۔

زبان کی اہمیت

کسی شاعر کی تخلیق کا جائزہ لینے کے لئے اسکی مستعمل زبان (Diction) کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔ بلکہ زبان ہی تجزیئے کی بنیاد ہوتی ہے۔ زبان کا وجود الفاظ سے ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے St. John کے اس جملے کو ادب کی دنیا میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ''In the beginning was the word''[1] ہمیں قرآن پاک میں یہ تصور ''کن فیکون'' میں نظر آتا ہے۔ اس لئے زبان کے متعلق ہڈسن کا یہ بیان دُرست ہے:

> ''While the many use language as they find it, the man of genius uses it indead, but subgects it with all to his own purposes and moulds it according to his own peculiarities''(2)

1- Dictionary of world Literary Terms P.314

2- An Introduction to the Study of Literature - P.28

اسی لئے تجربہ کار، سنجیدہ محقق اور نقاد کسی ادیب کی زبان سے ہی اُس کی شخصیت اور اس کے زمانے کا کھوج لگاتا ہے۔نوشہ صاحبؒ کا کلام پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کلام کسی ایسی ہستی کا ہے جس کا تصوف کے متعلق وسیع علم ہے اور جس کا تعلق گجرات کے مغربی علاقے تحصیل پھالیہ سے ہے۔ کیونکہ اُن کی خاص زبان، الفاظ،تشبیہات، استعارات اور علامات کے استعمال سے اُس علاقے کی نشاندہی ہوتی ہے اور اُن کا منفرد اسلوب بیان جنم لیتا ہے۔

نوشہ صاحبؒ کی شاعری کی زبان

نوشہ صاحبؒ نے اپنی پنجابی شاعری میں وہی زبان استعمال کی ہے جو اُن کے علاقے میں اُن کے زمانے میں مروج تھی۔ضلع گجرات کی سب سے بڑی تحصیل پھالیہ ہے اس کے مشرق میں گجرات شہر،مغرب میں سرگودھا کی تحصیل بھلوال، شمال کی طرف ضلع جہلم اور جنوب میں پنجاب کا مشہور دریا چناب ہے۔ یہی دریا تحصیل پھالیہ اور تحصیل گوجرانوالہ کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا ہے۔شمالی پہاڑ کے ساتھ دریائے جہلم کے کنارے آباد لوگ پوٹھوہاری لہجے سے بخوبی واقف ہیں اور مشرقی جانب رہنے والے لوگ گجرات کی بولی (جو سیالکوٹ اور گوجرانوالہ سے متاثر ہے) بولتے اور سمجھتے ہیں۔مغرب میں آباد لوگ سرگودھا کے لہجے یعنی لمبے کی بولی اچھی طرح جانتے اور خوبصورت طریقے سے بولتے ہیں۔تحصیل پھالیہ کا علاقہ ان تمام علاقوں کے درمیان یوں گھرا ہوا ہے جیسے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے درمیان ہتھیلی ہوتی ہے۔ اس لئے تحصیل پھالیہ کے لوگ اپنے اردگرد بولی جانے والی بولیوں کو سمجھتے ، بولتے اور اُن پر عبور رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ تمام بولیاں مل کر تحصیل پھالیہ کی مقامی بولی یا لہجے کو جنم دیتی ہیں۔ دیکھنے میں یہ لہجہ مخصوص اور آسان نظر آتا ہے لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ بڑا وسیع بھرپور اور میٹھا لہجہ ہے، جو تحصیل پھالیہ کے قصبات ساہنپال ، رنمل ،نوشہرہ

تارڑاں ، پاہڑیانوالی ، جانو چک، مانو چک، چھموں سہنا ، شاری ، عیدل، بھچر ، آ کی ، پانڈوال، میانوال ، رتو مکّے آل، بوسال ، سکھا ، مسیور ، پکا موسیٰ ، مانگٹ ، ہیلاں ، قادر آباد اور میانہ گوندل سے آگے منڈی بہاء الدین تک اچھی طرح سمجھا اور بولا جاتا ہے اور یہی لہجہ ان کی مادری زبان کا لہجہ ہے۔

اس علاقے کے لوگ بڑی (یے) کا زیادہ استعمال کرتے ہیں اور زبان بولتے ہوئے اس پر خاص زور دیتے ہیں۔ خاص طور پر جب کسی ڈھور ڈنگر کو بلاتے یا کسی بے جان شئے کا نام لیتے ہیں، اُس وقت یائے مجہول کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نہر سے نہرے، زور سے زورے، کیکر سے ککرے، کنک سے کنکے، کماد سے کمادے، بہشت سے بہشتے ، سبھ سے سبھے، خدا سے خدائے، بھلا سے بھلائے، دل سے دلے ، کھوہ سے کھوہے ، رنگ سے رنگے ، کھڑ سے کھڑوے ، کاہ سے کاہے ، وغیرہ۔ اسی طرح یائے معروف یعنی چھوٹی (ی) کا استعمال بھی عام کرتے ہیں۔ بعض الفاظ کو یائے معروف کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً کنڈھا سے کدھی (کنارہ) ، تھیا سے تھئی یا تھیسی۔ چھوڑ سے چھوڑی وغیرہ وغیرہ۔ یوں ہی چھوٹی (ی) کے ساتھ (س) کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں، جو اس علاقہ کی خاص پہچان ہے۔ مثلاً دینا سے دیسی، وسرنا سے وسرسی ، رکھنا سے رکھسی ، چھوڑنا سے چھوڑیسی، کرنا سے کریسی، سدنا سے سدیسی ، کھانا سے کھاسی ، تولن سے تولسی، ہونا سے ہوسی ، جانا سے جاسی ، آنا سے آسی ، آکھنا سے آکھسی اور فعل ماضی میں ان کی اشکال یوں بنتی ہیں۔ آکھیوس ، سدیوس ، کھادیوس ، تولیوس وغیرہ

اس کے علاوہ اس علاقہ کے لوگ اپنی عام گفتگو میں حرف ''ڑ'' بھی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات لفظ کے آخری حرف سے پہلے ''ڑ'' کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح اسم سے اسم تصغیر بنا لیتے ہیں۔ مثلاً سدھا سے سدھڑا ، چھوٹا سے چھوڑا، لسا سے لسڑا ، سوہا گہ سے سوہا گڑا، کوجھا سے کوجھڑا، مٹی سے مٹڑی ، جھوٹی سے

جھوڑی ، کالا کا کالڑا ، وغیرہ وغیرہ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بے شک یائے مجہول، یائے معروف اور ''ڑ'' کا بہت استعمال کرتے ہیں، اس کے باوجود یہاں کی بولی سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بلکہ اس لہجے سے پنجابی زبان میں مخصوص حسن اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔

جغرافیائی حالات سے الگ کچھ مقامی اور ثقافتی اثر کی بنا پر تحصیل پھالیہ کی زبان اردگرد کی تحصیلوں کے مقابلے میں قدرے موٹی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر لہندی لہجے کا اثر ہونے کے باوجود اس میں جھنگ سے ملتان تک کی سرائیکی لہجے کی کوملتا کم دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اس زبان کی مٹھاس اور خوبصورتی سے انکار ممکن نہیں۔ اس کی مٹھاس اور حسن کی چمک دمک ہمیں احمد یار مرالوی اور شیخوپورہ کے سید وارث شاہ کے کلام میں بخوبی جھلکتی نظر آتی ہے۔ سید وارث شاہ اپنے شاہکار قصہ ہیر رانجھا میں جٹ کو جٹیٹا، رانجھے کو رنجھیٹا لکھتے ہیں اس اعتبار سے ہم اسے وارث شاہی زبان بھی کہہ سکتے ہیں۔

نوشہ صاحبؒ کی پنجابی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں اُن کے کلام معجز نظام کی بے شمار خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں یہ خوبی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے کہ انہوں نے کم سے کم الفاظ استعمال کئے ہیں اور ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے کلام میں پوٹھوہاری لہجے کے بھی بہت سے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن اُن الفاظ کو اس خوبصورتی اور فنکاری سے استعمال کیا ہے کہ ان کی غیریت اور اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ وہ نوشہ صاحبؒ کی ہی زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے دو شعر دیکھئے۔

اُس بِن اُس دا بھیت نہ کوئی جاندا
اوہو دل تے آئے جو کجھ آندا[1]

1- گنج شریف ص 151

ایہہ رسالہ آکھیا نوشہ بالاں دی سکھیائی کان
مصحف پڑھن پڑھاؤن والے سوکھے مصحف پڑھن پڑھان(1)

ان اشعار میں لفظ آنے ، آندا ، کان خالص پوٹھوہاری لہجے کے الفاظ ہیں۔

نوشہ صاحبؒ کی ایک اور صفت یہ ہے کہ انہوں نے شعری ضرورت کی خاطر بعض الفاظ خود گھڑ لئے ہیں اور کچھ الفاظ کی ساخت میں کمی وبیشی کر لی ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

چاہاں مستی نام کارج ہون تمام(2)

.....

چوہڑا لنگھے راہ جس گندی دیوے باس
نوشہ عطری لنگھیاں عطر دی آوے ہولاس(3)

ان اشعار میں کار (بمعنی کام) سے کارج اور ہُلے (بمعنی جھونکے) سے ہولاس جیسے الفاظ نوشہ صاحبؒ کی ذہنی اختراع کا ثمرہ ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ قاری کو شعر پڑھتے ہی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

عربی فارسی الفاظ کا استعمال

عہد مغلیہ میں مدارس کے تعلیمی نصاب میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی ، فارسی کی تعلیم لازمی تھی اور حکومت کی سرکاری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ جو شخص عربی اور فارسی کا ماہر ہوتا تھا اُسے عالم فاضل سمجھا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں مہارت حاصل کرنا کتنی بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے

1- گنج شریف ص 272
2- ایضاً ص 158
3- ایضاً ص 552

کہ مغلیہ عہد کے بعد سکھوں کے دور حکومت میں فارسی ہی سرکاری زبان رہی۔ جبکہ ان کی مذہبی زبان پنجابی تھی۔ ہندو مسلم اور سکھ بلاتفریق فارسی زبان کا علم حاصل کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سکھ دور کے فارسی جاننے والے علماء میں سے حکیم عزیز الدین، فقیر نورالدین، مصر بیلی رام، دیوان امر ناتھ اکبری، دیوان دینا ناتھ، دیوان گنگارام وغیرہ کے نام گنوائے ہیں۔ (1) اسی دور کی عمدۃ التواریخ کے مصنف منشی سوہن لال، مجمع التواریخ کے مصنف پنڈت کاچر کے علاوہ منشی دیارام در اور کرنیل مہاں سنگھ بلند مرتبہ فارسی دان اور عالم تھے۔ پنجاب کے جملہ مدارس کا نظام در اصل وہی تھا جو مغلیہ عہد میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اُسے درس نظامی کہا جاتا تھا۔ مغلیہ عہد کے نصاب میں فارسی کی کتب گلستان، بوستان، دیوان حافظ، چہار مقالہ، مثنوی مولانا روم، منطق الطیر، یوسف زلیخا جامی، خمسہ نظامی، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی کے علاوہ اور بہت سی کتابیں شامل تھیں۔ ان میں سے بعض کتب کا ذکر مغلیہ عہد کے آخری اور سکھوں کے ابتدائی دور کے پنجابی شاعر سید وارث شاہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف قصہ ہیر رانجھا میں کیا ہے:

تعلیل میزان تے صرف بہائی صرف میر بھی یاد پکاری آنیں
قاضی کتب تے کنزالانواع باراں مسعودیاں جلد سواری آنیں
خانی نال مجموعہ سلطانیاں دے اتے حیرۃ الفقہ نروای آنیں
فتاویٰ برہنہ تے منظوم شاہنامہ نال زُبدیاں حفظ کراری آنیں
معارج النبوۃ خلاصیاں تے روضہ نال اخلاق پساری آنیں
گلستان بوستان اتے بہار دانش، طوطی نامہ تے رازق باری آنیں
منشأت نصاب تے ابو الفضل شاہنامہ تے واحد باری آنیں
قران السعدین دیوان حافظ شیریں خسرواں لکھ سواری آنیں (2)

1- سید عبداللہ ڈاکٹر: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ؛ مجلس ترقی ادب لاہور 1966ء ص 187
2- وارث شاہ: ہیر، مرتبہ عبدالعزیز بار ایٹ لا، پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور 1964ء ص 17

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اُس زمانے کے علماء عربی اور فارسی کے ماہر ہوتے تھے۔ لہٰذا نوشہ صاحبؒ نے ان زبانوں کا باقاعدہ علم حاصل کیا۔ کیونکہ دین اسلام کی تبلیغ کے لئے ان زبانوں کا جاننا ناگزیر تھا۔ آپ کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ جسکی شہادت آپ کے کلام سے ملتی ہے۔ لطائف گل شاہی کے حوالے کے مطابق آپ نے حالت جذب میں یہ شعر فرمائے۔

منادی ست در کوچہ میفروش   کہ امروز در ہر کہ پابند ہوش [(1)]
گریبانش گیرند و دامن کشند   کشاکش بدیوان مستاں برند

آپ کے کلام میں فارسی کے بے شمار الفاظ کا استعمال اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ آپ اس زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے اشعار میں عربی آیات کا بھی خوب استعمال کیا ہے اور نہایت فنکاری سے اُن کو شعر کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔ جس کی مثال دیگر شعراء کے ہاں بہت کم ملتی ہے:

مرد شہید نت جیئ ہے اساں قرآنوں جاتا
لَا تَقُوْلُو لِمَنْ يُّقْتَلُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتَا
کُٹھے ویکھے ظاہروں کس کیتا اوہناں دا خون
بَل اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْن [(2)]

نوشہ صاحبؒ نے بعض اشعار میں اپنے نام کو بطور قافیہ استعمال کیا ہے اور اُسکے ساتھ قافیہ ملانے کے لئے پوری عربی آیت کو شعر کا حصہ بنا دیا ہے۔ خاص طور پر کلمہ طیبہ کے استعمال سے شعر کو زینت بخشی ہے:

1- گل محمد نوشاہی، لطائف گل شاہی (قلمی) تصنیف 1153ھ مملوکہ کتب خانہ شرافت نوشاہی ساہنپال گجرات ص 334
2- گنج شریف ص 298

نت بولے نال یقین دے ڈولے نہیں نوشاہ
لَا اِلَہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدُ رَّسُوْلُ اللّٰہ [1]

o

پاک مرشد وچ ویکھیا پاک دیدار نوشاہ
اِیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ [2]

ان کے علاوہ چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔جن میں قرآنی آیات کا نہایت حسین استعمال ہے۔

فَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجَاھِدِیْنَ عَلَی الْقَاعِدِیْن آیاوچ قرآن
سچیاراں دی ریس کیہ نوشہ کرے بیان [3]

o

فَلَا یَقْرَبُو الْمَسْجِد الْحَرَام آیاوچ قرآن
اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ نوشہ کرے بیان [4]

o

نوشہ کہے مرد فقیر
اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر [5]

o

تجھ بن اور نہ پائے غیر
نِت نِت بِیَدِکَ الْخَیْر [6]

ان اشعار سے صاف عیاں ہے کہ نوشہ صاحبؒ قرآن پاک کے احکامات کا

1- گنج شریف ص252
2- ایضاً ص537
3- ایضاً ص289
4- ایضاً ص615
5- ایضاً ص94
6- ایضاً ص95

کس قدر ادراک رکھتے تھے اور عربی زبان پر کس قدر دسترس اُنہیں حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہایت سلیقہ مندی سے قرآنی آیات کو اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے فارسی الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں اس خوبصورتی اور سلیقے سے استعمال کیا ہے کہ وہ پنجابی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ محسوس نہیں ہوتے۔ ملاحظہ کیجئے چند اشعار:

مرشد نام ناموس دا داتا　　مرشد دے تل پتا نہ ماتا[1]
جو مرشد دا فرمانبردار　　تس دا حکم چلے چودھار
جو مرشد توں جامہ وارے　　مرشد تس دے کم سنوارے
صبر شکر جو شیوہ کرے　　تس دا بیڑا وہلا ترے

ان اشعار میں مرشد ، ناموس ، فرمانبردار، جامہ ، شیوہ ، وغیرہ فارسی الفاظ ہیں۔ مگر شعر پڑھتے وقت ان کی اجنبیت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔

محاورے اور آکھان

عام طور پر محاورہ کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ جب کوئی فعل اپنے اسم کے ساتھ مل کر حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہو تو اُسے محاورہ کہتے ہیں۔ محاورے کے استعمال سے زبان میں حسن ، بلاغت اور فصاحت پیدا ہوتی ہے اور کلام کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں آکھان میں گرائمر کی پابندیوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ آکھان (ضرب المثل) چند الفاظ کا ایسا باوزن جملہ ہوتا ہے جو حیاتی کے ان گنت تجربات کے بعد نتیجے کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ آکھان میں حکمت اور دانائی کی بات ہوتی ہے۔ یعنی کوزے میں دریا بند ہوتا ہے۔ محاورے اور آکھان کے استعمال سے کلام میں جہاں ادبی حُسن پیدا

1- گنج شریف ص237

ہوتا ہے وہاں ان کو کلام میں استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

حضرت نوشہ گنج بخش کے کلام میں بے شمار محاورے اور آکھان ایسے دکھائی دیتے ہیں جن کی بنا پر کلام کا حُسن دوبالا ہوگیا ہے اور اُس میں جاذبیت اور دلنشینی پیدا ہوگئی ہے۔

؎ کھجّی بھالے اوڑ نوں کنک بھالے برسات
سادھاں بھاوے چاناں چوراں کالی رات (1)

؎ وَیر کرے نِروَیر نال خود وَیر ہو ڈُھکے
تھُکّاں سٹے چن نوں مونہہ اپنا تھُکے (2)

؎ وڈھے مڈھ درخت دا اوہ آپے سُکے
چھِنج پئی درویش دی کدّی نہ چُکے (3)

؎ دوکھی مرد درویش دا کرے نکماّں وَیر
ایتھے اوتھے اوسدا مونہہ کالا نیلے پیر (4)

؎ جو دکھیاراں نوں دُکھ دیوے سَے دُکھ پاوے سوئی
نوشہ ہن کیہ کرسی کوئی جاں مونہوں لتھی لوئی (5)

؎ سچا مرشد پایا لہیے مبارکباد
چندی ہوئی سجناں تن من ہویا شاد (6)

1- گنج شریف ص554 2- ایضاً ص261
3- ایضاً ص262 4- ایضاً ص320
5- ایضاً ص360 6- ایضاً ص205

؎ ظاہر باطن کرے آراستہ مرشد کہیئے سوئے
انھے دے ہتھ دیوا بلدا عالم بنے نہ کوئی[1]

ان اشعار میں نوشہ صاحبؒ نے چن اُتے تھُکاں سٹنا، چھنج پینا، مونہہ کالا نیلے پیر، مونہوں لوئی لہنا، چندی ہونا، انھے دے ہتھ دیوا ہونا جیسے محاورے اور آکھان استعمال کئے ہیں۔

نوشہ صاحبؒ کا اندازہ بیان

نوشہ صاحبؒ اس اعتبار سے منفرد شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنے کلام میں نہ تو کوئی قصہ بیان کیا ہے اور نہ ہی قصوں کے کرداروں کو تشبیہات، تلمیحات اور علامات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ تو سیدھے سادھے صوفی شاعر تھے۔ شاعری کرنے سے اُن کا مقصد اپنے فنی کمالات دکھانا نہیں تھا بلکہ لوگوں کو اشعار کے ذریعے دین کی تبلیغ اور صراط مستقیم کی جانب راہنمائی کرنا تھا۔ اس لئے انہوں نے عشقیہ قصوں اور کرداروں کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ سیدھے سادھے انداز میں سیدھی باتیں کی ہیں، جن میں خلوص ہے اور پیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی باتیں براہ راست دل پر اثر کرتی ہیں اور پڑھنے والے کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں۔ یہ صفات نوشہ صاحبؒ کے ہم عصر شعراء کے ہاں مفقود ہیں۔ مثلاً آپ کے ہم عصر شعراء میں حافظ برخوردار (جنم 1030ھ) اور پیلو نے مرزا صاحباں کا قصہ مجازی رنگ میں لکھا اور قصہ گو شاعر ہونے کا ثبوت دیا۔ حافظ برخوردار کے قصہ مرزا صاحباں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحباں کا واقعہ آپ کے دور میں ہوا اور آپ کی دعا سے مرزا خان پیدا ہوا تھا۔ لیکن آپ نے اپنی شاعری میں اس قصے کو بھی جگہ نہیں دی اور نہ ہی اس سے قبل کے عشقیہ قصوں سے کوئی اثر قبول کیا۔ کیونکہ یہ آپ کا شعبہ نہ تھا۔ آپ تو صوفی اور درویش منش تھے۔ آپ نے صرف

1- گنج شریف ص220

دین اسلام کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا تھا۔ اور جب کبھی وضاحت کے لئے تلمیحات کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے قرآنی آیات کو تلمیحات کے طور پر استعمال کیا۔ مثلاً

امروی نہ منیا قارون دھرت لنگھاریا
ڈوبیا فرعون نوں نمرود پولیں ماریا[1]

صنائع بدائع

فارسی شاعری کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ فارسی گو شاعر اپنے کلام میں اپنی علمیت اور قابلیت کے اظہار کے لئے مختلف صنعتیں استعمال کرتے تھے۔ خاص طور قدیم مراثی میں مختلف صنعتیں ملتی ہیں۔ بقول عبدالسلام ندوی فارسی میں اسکی بنیاد سلمان ساؤجی [2] نے رکھی تھی۔ اس کے بعد خواجہ حافظ اور دیگر استاد شعراء نے اِسے خوب رواج دیا۔ جس کے نتیجے میں فارسی غزل کے حسن میں نکھار پیدا ہوا۔ اس روایت کی تقلید میں اردو شاعری میں بھی مختلف صنعتیں مروج ہوئیں۔ خاص طور پر دبستان لکھنؤ میں ان کا خاص اہتمام کیا گیا اور غزل میں مختلف اقسام کی صنعتیں استعمال کی گئیں۔ مثلاً خواجہ حیدر علی آتش کے ایک شعر میں صنعت حسن تعلیل ملاحظہ کیجئے:

میرے طرح سے مہہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

حضرت نوشہ گنج بخشؒ قادر الکلام شاعر تھے اور وہ مختلف صنعتوں کے پرعبور رکھتے تھے۔ ان کی اردو مثنوی گنج الاسرار میں بھی بعض مقامات پر صنعتوں کا دلکش استعمال ملتا ہے۔ مثلاً صنعت تشبیہہ کا استعمال دیکھئے:

1- گنج شریف ص 527
2- عبدالسلام ندوی: شعر الہند، حصہ دوم معارف اعظم گڑھ 1949ء ص 412

جیوں کر پیر کرے تلقین　　لاگ رہے جیوں جل میں مین [1]

تیں کلمے ار چودہ حرف　　جیوں سورج پگھلاوے برف [2]

فارسی ایک طویل عرصے تک پنجاب کی علمی ، ادبی اور سرکاری زبان رہی ہے۔ اسلئے اس کا پنجابی زبان و ادب پر گہرا اثر ہوا چنانچہ پنجابی شاعروں نے بھی فارسی کے زیر اثر اپنے کلام میں صنعت تجنیس، تجنیس تام ،تجنیس ترصیع، صنعت تضاد، صنعت مقلوب، صنعت مراعاۃ النظیر ،صنعت لف ونشر مرتب و غیر مرتب، صنعت حسن تعلیل اور صنعت ابہام وغیرہ کو بطریق احسن استعمال کیا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ صنعت کے استعمال کے بغیر کلام میں حسن پیدا نہیں ہوتا یا ان کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ ایسی بات ہرگز نہیں۔ اصل بات تو جذبے کی صداقت اور الفاظ کو استعمال کرنے کا ڈھنگ ہے۔ نوشہ صاحبؒ کے پنجابی کلام میں ان صنعتوں کا استعمال اگرچہ کوئی زیادہ نہیں پھر بھی لفظوں کے انتخاب اور استعمال کا وہ سلیقہ موجود ہے جس سے کلام معجز نظام بنتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے شعوری کوشش سے ان کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ اگرچہ انہیں ان صنعتوں کے استعمال پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس بات کا ثبوت ان کے اردو اور پنجابی کلام سے ملتا ہے۔ جس میں صنعت مراعاۃ لنظیر ، صنعت تجنیس، صنعت تلمیح ،صنعت تشبیہہ کا خوبصورت استعمال موجود ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آپ نے ان تکلفات سے دور رہ کر جو نہایت کامیاب شاعری کی ہے، وہی آپ کی امتیازی حیثیت کا سبب ہے۔ آپ نے ضائع بدائع پر عبور رکھنے کے باوجود انہیں پنجابی شاعری میں بہت کم استعمال کیا۔ شاید اسکی وجہ یہ تھی کہ آپ کا مخاطب طبقہ گاؤں کے سیدھے سادھے ان پڑھ لوگ تھے۔ اگر اُن کے سامنے دقیق انداز میں گفتگو کی جاتی تو شاید اسے سمجھ نہ سکتے۔ نوشہ صاحبؒ کو سیدھے

1- گنج الاسرار، ص 33

2- ایضاً ص 37

سادے انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ آپ نے کسی دربار سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا کہ صلہ و ستائش کیلئے فن شاعری کے کمالات دکھاتے۔ آپ ہمیشہ ان باتوں سے بے نیاز رہے۔ نہ کسی حاکم سے محبت، نہ کسی کا خوف آپ کے پیغام کی ترسیل میں مانع رہا۔ اس لئے آپ نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے کبھی ان تکلفات کا سہارا نہ لیا۔ آپ نے جو کچھ محسوس کیا، اُسے نہایت سادہ اور دلکش انداز میں بیان کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد کی مثال آپ کے کلام پر صادق آتی ہے۔ آپ کا یہی کمال قابل ستائش ہے کہ آپ نے سادگی میں حسن پیدا کیا۔ تاہم آپ کے کلام سے چند ایک صنعتیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا آپ کے کلام میں وجود آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

مراعاۃ النظیر

صنعت مراعاۃ النظیر سے مراد ہے کہ کلام میں کچھ ایسی چیزوں کا ذکر کیا جائے جو آپس میں مناسبت رکھتی ہوں مگر یہ مناسبت تضاد کی شکار نہ ہو۔ جیسے اردو کا ایک شعر ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیرو تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اس شعر میں شاعر نے کوہکن، جوئے شیر، تیشہ اور سنگ گراں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کی آپس میں مناسبت ہے۔ حضرت نوشہ صاحبؒ کا ایک شعر اسی صنعت مراعاۃ النظیر میں دیکھئے۔

موئے نوں نہ ماریئے مت اوہ بھی مارے آہ
نوشہ لوہا گالسی ، موئی کھل دا ساہ (1)

1- گنج بخش ص515

پرانے زمانے میں لوہا گرم کرنے کے لئے لوہا کوئلوں کی بھٹی میں رکھتے تھے اور کوئلوں کو دہکانے کے لئے خشک کھال کی مشک سے ہوا دیتے تھے جسے دھونکنی کہتے تھے۔ دھونکنے سے نکلنے والی ہوا کوئلوں کو انگارے بناتی تھی جن پر لوہا سرخ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس شعر میں کھل، ساہ، لوہا، گالسی صنعت مراعاۃ النظیر پیدا کر رہے ہیں۔

صنعت تلمیح

صنعت تلمیح سے مراد ہے کہ کلام میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن میں قرآن، احادیث یا کسی مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔ یہ صنائع معنوی کی ایک قسم ہے۔ شعر میں اس کے استعمال کا یہ فائدہ ہے کہ شاعر کو کوئی واقعہ بار بار دہرانا نہیں پڑتا۔ وہ ایک دو الفاظ میں مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، جن سے شعر میں بلاغت پیدا ہوجاتی ہے۔ تلمیح کے استعمال کے لئے شاعر کا مطالعہ وسیع ہونا شرط ہے اور اسے مادری زبان کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ زبانوں پر بھی عبور حاصل ہو۔ یہ مطالعہ اُسے شاعری میں تلمیحات استعمال کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ نوشہ صاحبؒ کے کلام میں نہایت دلکش تلمیحات دکھائی دیتی ہیں۔

قرآن پاک میں ایک مشہور واقع درج ہے کہ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ جلائی تھی۔ پھر اُس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھلانگ لگانے کے لئے کہا تھا۔ اُن کا دین سچا اور عزم پختہ تھا۔ اس لئے بے خطر آگ میں چھلانگ لگا دی اور نمرود کی جھوٹی خدائی کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ آگ گلزار بن گئی۔ حضرت یونسؑ کی اُمت نے اُن کا جینا دوبھر کر دیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا اور اپنے پیٹ میں پناہ دی۔ پھر وہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ سلامت نکل آئے۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حسد کی بنا پر انہیں کنوئیں میں دھکیل دیا۔ پھر اللہ کی حکمت نے انہیں کنوئیں سے نکالا اور وہ عزیز مصر بن

گئے۔حضرت نوحؑ کی کشتی والا واقعہ بے حد مشہور ہے۔ جب قوم خدا کے حکم کی حدود پار کر گئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا طوفان آیا کہ اُن کی کشتی کے سوا سب کچھ غرق ہوگیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو لوگوں نے سولی پر لٹکا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ سلامت آسمان پر اٹھالیا۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو مارنے کے لئے کیا کیا نہ جتن کئے۔ دیوؤں کی ایک ٹولی نے حضرت سلیمانؑ کو دُکھ دینے کی کوششیں کیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر بلا سے محفوظ رکھا اور قدم قدم پر اُن کی مدد کی۔ قرآن پاک میں یہ سب واقعات پوری صحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ اپنے دور کے عظیم صوفی، مبلغ دین اور عالم تھے۔ اس لئے قرآن پاک کے یہ تمام واقعات اور فرمان انہیں یاد تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ان واقعات کو موقع محل کے مطابق تلمیحات کے طور پر استعمال کیا ہے کہ پڑھنے والا ایک طرف اُن کی علمیت کا قائل ہو جاتا ہے تو دوسری طرف اُن کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے ایک ایک مصرعے میں بڑے بڑے واقعات کو بطریق احسن سمویا ہے۔ سات شعروں کی ایک نظم دیکھئے جن میں مندرجہ بالا واقعات تلمیحات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

صاحب ایہہ فرمایا وچ قرآن — آکھ محمد مصطفیٰ جو کجھ مجھ فرمان
دے خوشخبری مومناں روز قیامت تیک — مدد اللہ دی تساں نوں فتح تساں نزدیک
تساں رکھوالا حق ہے حافظ رب رحیم — رکھ لیا جس اگ تھوں حضرت ابراہیمؑ
یونسؑ نوں جس رکھیا مچھی سندے پیٹ — یوسفؑ کھوہے رکھیا خرقہ نال لپیٹ
نوحؑ طوفانوں رکھیا کر جہاز اسوار — عیسیٰؑ قوم تھوں رکھیا سدیا اُپر وار
موسیٰؑ رکھیا فرعون تھوں دیواں تھیں سلیمانؑ — فتح دتی پیغمبراں تابع کیتا جہان
تھوڑے بوہتے اوسدے جس بھاوے تس دیہہ — ہمت مول نہ ہاریئے نوشہ آکھے ایہہ(1)

اس مختصر سی نظم کے چار مصرعوں میں سات تلمیحات استعمال کرنا صرف نوشہ صاحبؒ کا ہی

1- گنج شریف ص 299

حصہ ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں فرعون کے ساتھ ساتھ قارون کے حشر کو بھی بیان کیا ہے اور اُس سے یہ اخلاقی سبق ظاہر کیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اُس کا انجام برا ہوگا۔

امر وی نہ منیا قارون دھرت نگھاریا
ڈوبیا فرعون نوں نمرود پولیس ماریا[1]

تشبیہات کا استعمال

جب ایک چیز دوسری چیز کی مانند قرار دی جاتی ہے اور دونوں چیزوں میں ایک یا ایک سے زیادہ صفات مشترک ہوتی ہیں تو اُسے تشبیہ کہتے ہیں۔ علماء نے تشبیہ کو شاعری کا سنگار کہا ہے۔ کیونکہ اس سے شاعری میں فصاحت و بلاغت کے علاوہ تاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ تشبیہ کی عمارت کے پانچ ستون یا ارکان ہوتے ہیں۔ (۱) مشبہ (۲) مشبہ بہ (۳) وجہ شبہ (۴) غرض تشبیہ (۵) حروف تشبیہ۔ ان میں سے مشبہ اور مشبہ بہ کو طرفین تشبیہ یا اطراف تشبیہ کہتے ہیں۔ تشبیہ کی باراں مشہور اقسام یہ ہیں:
(1) تشبیہ جمع (2) تشبیہ تسویہ (3) تشبیہ قریب (4) تشبیہ بعید (5) تشبیہ ملفوف (6) تشبیہ مفروق (7) تشبیہ مرسل (8) تشبیہ موکد (9) تشبیہ مجمل (10) تشبیہ اضمار (11) تشبیہ منفصل (12) تشبیہ مقبول

نوشہ صاحبؒ کے کلام میں ہمیں نہایت خوبصورت تشبیہات دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً:

صاحب ہووے مہربان تاں درویشاں سنگ میلے
ستھر بیٹھے ستھرے جیوں شینہہ وچ بیلے [2]

1- گنج شریف ص 326
2- ایضاً

ذیل کے شعر میں ماتھے کو لوح محفوظ سے تشبیہہ دی ہے:

جو متھے دا لکھیا تس نوں پڑھے نہ کوئے
نوشہ لوح محفوظ دا کون جو واقف ہوئے (1)

ان اشعار میں دیکھئے نوشہ صاحبؒ نے نہایت فنکاری سے جسم کو باجے سے تشبیہہ دے کر بیان میں حسن پیدا کیا ہے:

تن رباب تے ناڑیں تاراں عشق ٹھنگوراں لاوے
واجے دے وس بولن ناہیں بولے جو بلاوے
مونہہ موڑے تاں کن مروڑے بھانویں کیویں ہلاوے
نوشہ کہے فقیر قادر دا قدرت دے جَس گاوے (2)

نوشہ صاحبؒ نے مرشد کے حوالے سے بعض مقامات پر بے حد اچھوتی اور منفرد تشبیہات استعمال کی ہیں۔ جو اُن کے کائنات کے وسیع مطالعے اور سلجھے ہوئے ذوق کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مولا جس نوں ملیا چاہے مرشد تس نوں میلے
مرشد ملیاں دھوپن میلاں جیوں برکھا لاہے تیلے (3)

o

نوشہ دبھتا گرہن ہے عشق مرشد دا چن
جے تیئں مرشد منیاں تاں ہور نہ کوئی من (4)

o

1- گنج شریف ص346
2- ایضاً ص360
3- ایضاً ص208
4- ایضاً ص212

پتر جویں درخت دے ڈھٹھے ہون ہک تھاں
وا چلے اڈ جان سبھ رہے نہ لکھ دا ناں [1]
تویں مرشد دے ڈٹھیاں رہے نہ ہک گناہ
میں مرشد دے واریا کہے فقیر نوشاہ

تشبیہہ کی کچھ مزید نادر مثالیں دیکھئے:

بے مرشد دی سنگت کھوٹی جیوں کجل دی کوٹھی
سے موڈھ کو لگ کمینے جو غفلت دی پوٹھی [2]

o

بن باطن ظاہر بے معنی جیوں بے مغز بادام
علم اوہ جو دل تے لگے نہیں تاں کیسے کام [3]

o

کلمہ پل صراطوں پل وچ پار لنگھائے
بجلی سندی لشک جیوں تیوں نوشہ لنگھ جائے [4]

ہندی الفاظ کا استعمال

مثنوی گنج الاسرار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نوشہ صاحبؒ کو ہندی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اسکی شہادت گنج الاسرار کے بہت سے اردو اشعار سے ملتی ہے۔ جن میں آپ نے ہندی کے ان گنت الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن یہ الفاظ نہایت سلیقے

1- گنج شریف ص217
2- ایضاً ص546
3- ایضا ص220
4- ایضاً ص374

سے استعمال کئے گئے ہیں کہ قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ یہ ہندی زبان کے الفاظ ہیں۔ آپ نے ہندی الفاظ کو مفہوم کے اعتبار سے اس قدر دلکش انداز میں استعمال کیا ہے کہ اگر اُن کی جگہ کسی اور زبان کا لفظ استعمال کیا جائے تو غیر مناسب اور بے جوڑ معلوم ہوگا اور شعری حسن زائل ہو جائیگا۔ بلکہ شعری تاثیر متاثر ہوگی۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر مثنوی گنج الاسرار سے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

توں کیا جانے میرے کام　　کون آیت ارکون ہر نام [1]
جے چاہیں بے رنگی بھیکھ　　ستگور کا توں چہرہ ویکھ
محض خدا رسولؐ کی خاطر　　یہ نسخہ میں کیا ساطر [2]
جیوں کر پیر کرے تلقین　　لاگ رہے جیوں جل میں مین [3]
اچپا جاپ ہے جس نے کینا　　مکت پرابت اُس نے لینا
ایڑا پنگلا پون کوں پیوے　　دس سوں چاڑھ باندھ سکھ جیوے
چار بھانت یہ بارش جان　　ایک سیں ایک لطیف پچھان [4]

ان اشعار میں ہرنام، بھیکھ، ستگور، ساطر، جل، مین، اچپا جاپ، مکت پرابت، اِیڑا پنگلا، پون کوں، پیوے، بھانت سب ہندی الفاظ ہیں۔ اسی طرح آپ کی پنجابی شاعری میں ہندی الفاظ کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار سے نوشہ صاحبؒ کے فنی کمال کی نشاندہی ہوتی ہے۔

وَن دَن وچ چھپے ناہیں نوشہ ہک نِروَن
جیو رکھ سل تارے انبر اگن پَوَن جل دھن

1- گنج الاسرار ص 31
2- ایضاً
3- ایضاً ص 32
4- ایضاً ص 35

نِر دنوں سب وَنّ پونّے نردنوں ہروَن
نوشہ ہوندے ون پونّے مڑ بھی اوہ نِروَن[1]

قرآنی آیات کے تراجم

نوشہ صاحبؒ اپنے دور کے بلند مرتبہ اور سچے مبلغ تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری سے صرف تبلیغ کا کام لیا۔ چنانچہ عوام کو دینی مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے آپ نے قرآن پاک کے احکامات کو نظم کے روپ میں پیش کیا، تاکہ پڑھنے اور سننے والے ان قرآنی احکامات کو اپنی مادری زبان میں سن کر سمجھیں۔ پھر دل و جان سے اُن کو قبول کریں اور صدق دل سے اُن پر عمل بھی کریں۔ ان کی اس کاوش سے جہاں دین کی تبلیغ کا فریضہ ادا ہوا وہاں زبان و ادب کی خدمت کا حق بھی ادا ہوتا گیا۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَقُولُو لِمَنْ يُّقْتَلُو فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَل اَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَّاتَشْعُرُون"[2]

ترجمہ: جولوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ جیتے ہیں۔ لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔

نوشہ صاحبؒ نے قرآن کے اس مضمون کو یوں شعری روپ دیا ہے۔

جو کٹھے راہ خدائے دے موئے آکھو ناں
سدا سدا اوہ جیوندے ناہیں خبر تساں[3]

o

1- گنج شریف ص438
2- القرآن پارہ 2 سورۃ البقرۃ آیت 154
3- گنج شریف ص350

اس سورۃ کا اگلا حصہ اس طرح ہے:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وُالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرَ الصّٰبِرِيْنَ" (1)

ترجمہ: ہم تمہیں کو ضرور آزمائیں گے۔ ڈر، خوف اور بھوک، مال اور جان اور پھلوں میں گھاٹے سے لیکن صبر کرنے والوں کے لئے خوشخبری ہے۔

نوشہ صاحبؒ نے اس مضمون کو یوں منظوم کیا ہے:

صبر کیتا جنہاں خوف وچ یا وچ بھکھ نقصان
گھاٹا مال یا آدمیاں یا وچ میوے دھان (2)
اوہناں بشارت رب دی ہادی اوہناں خدا
نوشہ یادی اوسدا جس دتا ایہہ سمجھا

قرآن پاک کا ارشاد ہے:

"وَاَنْ يَّكُنْ مِنْكُمْ مِّائَةٌ يَغْلِبُو اَلْفاً مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (3)

ترجمہ: اگر تم سو بندے (مسلمان) بھی ہو تو ہزار کافروں پر بھاری رہو گے۔

نوشہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ مختصر مگر جامع انداز میں یوں کیا ہے:

مومن صابر ہووے سَے تے کافر ہووے ہزار
آیا حکم قرآن وچ جو کافراں دیسن مار (4)

1- القرآن پارہ 2 سورۃ البقرۃ آیت 155
2- گنج شریف ص 350
3- القرآن پارہ 10 سورۃ انفال
4- گنج شریف ص 351

قرآن مجید کی اس آیت کا اگلا حصہ اس طرح ہے:

" اَنْ یَّکُنْ مِنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوا مِأَتَیْنِ" (1)

ترجمہ: اگر تم مومن بیس صبر والے ہو گے تو دوسو پر غالب رہو گے۔

اس بارے نوشہ صاحبؒ کا شعر ہے:

ہِک صابر دس کافراں مارے مار چلائے
آیا وچ قرآن دے نوشہ دے سنائے (2)

قرآن پاک کا فرمان ہے:

"نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِالْمُؤمِنِیْنَ"

ترجمہ: اللہ کی طرف سے فتح و نصرت ہمارے قریب ہے اور خوشخبری ہے مومنوں کیلئے۔

نوشہ صاحبؒ نے اس مضمون کو یوں شعر کے قالب میں ڈھالا ہے:

صاحب ایہہ فرمایا وچ حضرت قرآن
آکھ محمد مصطفیٰ جو کجھ مجھ فرمان (3)
دے خوشخبری مومناں روز قیامت تیک
مدد اللہ دی تساں نوں فتح تساں نزدیک

قرآن پاک کا فرمان ہے:

" اَطِیْعُو اللّٰہَ وَاَطِیْعُو الرَّسُوْلَ وَ اُولِیِ الْاَمْرِمِنْکُمْ"(4)

ترجمہ: اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور اپنے میں سے اولی الامر (حاکم) کی۔

1- القرآن پارہ 10 سورۃ انفال آیت 155
2- گنج شریف ص 351
3- ایضاً ص 299
4- القرآن پارہ 5 سورۃ النساء آیت 59

نوشہ صاحبؒ کا منظوم ترجمہ ہے:

من فقیرا حکم رب رسول دا
حکم مرشد دا من ایہہ مدعا مول دا [1]

اولی الامر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللہ ایہہ فرمایا وچ قرآن دے
نوشہ مَنن سَے جو اہل ایمان دے [2]

مرشد صاحب امر ہے امر مرشد دا من
آکھے نوشہ قادری دھن مرشد جی دھن

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ مومنین سے مخاطب ہیں:

"یـا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اسْتَعِیْنُو بِاالصَّبْرِ وَالصَّلوٰۃ اِنّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِین" [3]

نوشہ صاحبؒ نے شعروں میں اسے یوں پیش کیا ہے:

مدد منگو تسیں مومنو بندگی صبر دے نال
اللہ ہے نال صابراں ہر ویلے ہر حال [4]

احادیث کے تراجم

قرآن پاک کے احکامات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے فرمان ہی قرآن پاک کی تفسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگان دین نے دین اسلام کی وضاحت وصراحت کے لئے قرآن

1- گنج شریف ص242
2- ایضاً
3- القرآن پارہ2 آیت 153
4- گنج شریف ص350

پاک کے بعد سب سے معتبر سہارا اور حوالہ احادیث کو ہی سمجھا ہے۔ نوشہ صاحبؒ نے بھی جہاں قرآن پاک کی تعلیمات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہاں کئی ایک احادیث سے بھی اپنے فکر کے نکھار کے لئے روشنی حاصل کی ہے۔ چنانچہ اُن کے کلام میں بہت سی احادیث کا بیان ملتا ہے۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر چند ایک حوالے اور اشعار پیش کرتے ہیں تا کہ نوشہ صاحبؒ کی ترجمہ نگاری کا فن نکھر کر سامنے آ سکے۔

حدیث ہے:

"لَایُؤمِن اَحد کم حتی اکون احب الیه من والده ولده والنّاس اجمعین"[1]

منظوم ترجمہ:

جس پیارا میں پتروں پیوؤں ودھ وی جس
سو مومن درگاہ دا حضرت آکھیا تس [2]

کمال یہ ہے کہ نوشہ صاحبؒ نے ایک ایک مصرعے میں ایک ایک حدیث بیان کر دی ہے۔

حدیث: "اَلدّنیا جیفة و طالبها کلاب"

منظوم ترجمہ:

دنیا جیفہ طالب کُتے سنو وو دنیا دارو
فقر فخر حضرت فرمایا درویشو سچیارو [3]

حدیث: "ولَورُدتُ أنّی قُتِلتُ، قَاتَلتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحیِیتُ ثُمَّ قُتِلتُ ثُمَّ اَحیِیتُ ثُمَّ قُتِلتُ"[4]

1- ابن ماجہ، مقدمہ 9۔ نسائی: ایمان 19، بخاری: ایمان 8، مسلم: ایمان 70
2- گنج شریف ص 370
3- ایضاً ص 582
4- نسائی: جہاد 30، مسند امام احمد بن حنبل 473, 496, 503

منظوم ترجمہ:

جنگ کرن دا اجر گھنیرا حضرت نے فرمایا
کائی عبادت جنگ جیہی ناہیں وچ حدیثاں آیا[1]
بھی فرمایا آپ حضرت نے سُن پیارے سچیارا
لکھ کروڑ صلوٰۃ سلاماں ہووس وارو وارا
جے شہید ہوواں وچ جنگے تے پھر رب جواوے
مڑ بھی جنگ کراں کفاراں ایہہ میرا دل بھاوے

حدیث: "قال رسول اللہ ﷺ رِزْقِی تَحْت ظِلِ رُمحِی"[2]

منظوم ترجمہ:

نوشہ کہے توں سن سچیارا ایہہ کتابیں آیا
رزق میرا نیزے دی چھاویں حضرت نے فرمایا[3]

اسی طرح آپ نے بے شمار احادیث کو شعری روپ میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں طوالت سے بچنے کے لئے صرف چند اشعار کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ گنج شریف میں ان گنت امثلہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نوشہ صاحبؒ نے ایمان کی صفات کو بھی نظم کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ کیونکہ ایمان کی بنیاد توحید اور رسالت ہے۔ پھر صفاتِ ایمان کا ذکر آتا ہے۔ جب تک کوئی مسلمان ایمان کی صفات دل و جان سے تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اُس کا ایمان پختہ نہیں ہوتا۔ ان صفات کے بیان کو ایمان مفصل کہا جاتا ہے۔

ایمان مفصل: " آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ

1- گنج شریف ص 297
2- بخاری شریف: الجہاد۔ 88
3- گنج شریف ص 295

خَیرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْت"

نوشہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

منیا اللہ پک کر خاوند خود مختار　　پاک محمدؐ منیا نبیاں دا سردار (1)
منے سبھ فرشتے درگاہ دے مقبول　　سبھ کتاباں منیاں منے سبھ رسول
روز قیامت آونا اس وچ ناہیں بھول　　نیکی بدی اللہ ولوں ایہو دونوں تول
مار اٹھاون سچ ہے روز قیامت دے　　نوشہ مرشد منیاں من قبول پئے

ایمان مجمل کو بھی نوشہ صاحبؒ نے منظوم کیا ہے:

ایمان مجمل: آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَآئِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ

منظوم ترجمہ:

اللہ اونویں منیا جیویں اسم صفات
منے حکم اللہ دے نوشہ بھئے نجات (2)

خوبصورت قوافی

شعر کے آخر میں اور ردیف سے پہلے جو ہم آواز الفاظ استعمال ہوتے ہیں اُن کو قافیہ کہتے ہیں جس شعر میں ردیف نہیں ہوتی اُس میں قافیہ آخر میں آتا ہے۔ اگرچہ بعض نقادوں نے شعر میں قافیہ کو ضروری خیال نہیں کیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قافیہ کے استعمال سے شعر میں حسن اور تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے مناسب قافیہ کے استعمال کو ایک فنی کمال سمجھا جاتا ہے۔ انوکھے، منفرد اور مشکل قوافی استعمال کرنا ہر شاعر کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اس کے لئے شاعر کے پاس جہاں الفاظ کا وسیع ذخیرہ ہونا چاہیے، وہاں اُن الفاظ کے مفاہیم اور صوتی آہنگ کے مطابق اشعار

1- گنج شریف ص 241
2- ایضاً ص 242

میں اُن کے استعمال کا سلیقہ ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ تب ہی شاعر معیاری شعر کہہ سکتا ہے۔ ہمیں یہ تمام خوبیاں نوشہ صاحبؒ کی شاعری میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہیں۔ آپ اپنے کلام میں خوبصورت، انوکھے اور منفرد قوافی استعمال کرنے میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کی بہترین قافیہ پیمائی سے جہاں شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے وہاں اُن کا صوتی آہنگ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر عجب سا سرور چھوڑتا ہے۔ مثلاً چند اشعار دیکھئے:

بہشت کمائی بھلے دی بُرے دی دوزخ کھٹ
کیتا پاوے اپنا کیہ سید کیہ جٹ (1)
بہشتیں موجاں مان سن ہر فرقے دے نیک
دوزخ بداں نصیب ہے بُرا بدی دا سیک
جیہڑا قائم شرح تے سوئی مرد فقیر
آکھے نوشہ قادری غیر شرع بے پیر
فقہ باجھ فقیری ناقص سُن پارے سچیار
باجھ فقیری فقہ معطل نوشہ کہے پکار
جے سَے وسے دین دے راہے تیر تفنگ
جو ہووے سو آ گلا نوشہ مڑے نہ انگ
جے جگ وسے میگھلا تیر تفنگ تروار
حکم بناں کجھ ہوئے نہ نوشہ کہے پکار (2)

فن شاعری میں ''ڑ'' کا قافیہ مشکل ترین قافیہ شمار ہوتا ہے۔ اشعار میں اس قافیے کو نبھانا بے حد دشوار کام ہے۔ ایسے قوافی صرف وہی شاعر استعمال کر سکتا ہے جسے

1- گنج شریف ص266
2- ایضاً ص270

فن شاعری پر مکمل عبور حاصل ہو۔ گنج شریف میں کئی ایک مقامات پر ہمیں ایسے قافیے دکھائی دیتے ہیں جو بے حد مشکل اور خاصے تنگ قوافی ہیں۔ لیکن نوشہ صاحبؒ نے اپنی طبع رواں کے باعث اُن کو اشعار میں خوب نبھایا ہے۔ مثلاً:

عدم بہشت تے ایہہ دم دوزخ، دوزخ اندر ساڑے
آس ہراسیں ایتھے پھاتھے اُڈ دے پنکھی تاڑے[1]
عدم دیس وچ وسدے آہے ہوون چائے اجاڑے
نوشہ ایس دنیا دے آون کیڈے پاڑن پاڑے

o

رمل طب نجوم بے حاصل شدنی کوئی نہ موڑے
حکم باجھ کجھ ہووے ناہیں لکھ نہ کوئی توڑے[2]
فالاں ٹُون تویت نہ جانے جو مرشد سنگ جوڑے
نوشہ ہوئے تقدیر دا لکھیا جے سَے کوئی موڑیا لوڑے

''اڑنون'' کا قافیہ ''ڑ'' کے قافیہ سے بھی مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ لیکن نوشہ صاحبؒ نے اسے بھی بطریق احسن نبھایا ہے۔ ایک شعر نمونے کے طور پر دیکھئے:

چھوٹی رات کہانی وڈھی انگن چھوٹا تے تانی وڈھی
جھ نہ وڈی بانی وڈھی نوشہ گل ربانی وڈھی

اس شعر میں تانی اور ربانی جیسے قافیے قابل تعریف ہیں۔

ماحول کی عکاسی

شاعر جس ماحول میں زندگی گزارتا ہے، وہ ماحول اُسکی سوچ اور فکر پر ضرور

1- گنج شریف ص583
2- ایضاً ص130

اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں اُس کے عہد کے ماحول کے لوگوں کا ذکر ، ثقافت ، تہذیب اور بودوباش کی جھلکیاں محض ماحول کے زیر اثر ہوتی ہیں۔تہذیب وتمدن کی یہ جھلکیاں ایک طرف تو اُس کے ثقافتی ماحول کی نشاندہی کرتی ہیں تو دوسری طرف شاعر کی اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ انمٹ فکری محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔نوشہ صاحبؒ کے کلام میں اُن کے ماحول، ثقافت، تہذیب وتمدن کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ایک چومصرعہ دیکھئے۔جس میں گاؤں کی بودوباش سے تشبیہات لے کر اپنے صوفیانہ خیالات کو نظمایا ہے:

سُستی چھوڑ دین کمایو ، دنیا رڑھ آخر دی
رات دینہہ دا کالا دھولا جوگ واہن نوں پھردی [1]
عُمرا رُت بیائی والی واہ قدرت قادر دی
جیٹھی کنک تنہاں دی نوشہ جنہاں کیتی پوکھی سردی

اُس زمانے کے گاؤں کے لوگوں کا ذریعہ معاش ، آپس کے تعلقات اور زندگی گزارنے کے طریقے یوں بیان کئے ہیں:

دیوا بنے کمہار تھوں تیلی کڈھے تیل
تِل کپاہ کم راہکاں کم جوگت دا میل [2]

پرانے زمانے میں مسافروں کے لئے رات گزارنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ اُن کے قیام کے لئے جگہ جگہ سرائے بنی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ عوام مسافروں کو اپنے گھروں میں رکھنا اور اُن کی خدمت کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ اس کی عکاسی

1- گنج شریف ص269
2- ایضاً ص393

نوشہ صاحبؒ کے اشعار میں یوں دکھائی دیتی ہے:

سورج گیا گھر اپنے سبھناں گھر سمھالیا
آہلنا ڈھونڈیا پنکھیاں او تھے واسا آلیا
ٹرنا چھڈیا پاندھیاں وستیں آسرا بھالیا
ہویا ویلا شام دا گھر گھر دیوا بالیا
وقت آیا بسرام دا نوشہ اللہ والیا
دن گزریا آرام نال جیوں خالق تیوں جالیا
رات وہائی نوشہ، رب اگے سرنوالیا[1]

نوشہ صاحبؒ خود بھی درویش تھے اور درویشوں کے قدر دان تھے اور لوگوں کو ہمیشہ درویشی کی تعلیم دیتے تھے۔ مگر ہر زمانے میں کچھ نام نہاد پیر اور مُلّاں ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ سادہ لوح لوگوں کو لوٹتے اور بیوقوف بناتے تھے۔ نوشہ صاحبؒ ایسے جاہل، جعلساز اور دین کے نام نہاد ٹھیکداروں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا ہے تا کہ مخلوق اُن کے فریب سے محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ آپ اپنے دور کے جعلساز مُلّاؤں اور پیروں کے خلاف یوں آواز بلند کرتے ہیں:

مُلّاں لوک کرن مُلّائی — حجت کر اوہناں خلق وکھائی[2]
شیخاں لے مشائخی چائی — اوہناں بدعت ہور چلائی
مڈھوں داڑھی مچھ منائی — اپنی خوبی آپ گوائی
لے فقیراں ٹوپی پائی — بھنگ تمبا کو وچ نہیں فقرائی
اندر باہر جہاں صفائی — دونویں جگ تنہاں دوہائی
نوشہ کہے فقیر گدائی — مرشد سانوں گل سمجھائی

1- گنج شریف ص 296
2- ایضاً ص 196

نوشہ صاحبؒ نے ایسے پیروں فقیروں کے روّیے کو سخت ناپسند کیا ہے جو خود تو کسی قابل نہیں ہوتے اور صرف اپنے بزرگوں کے نام کی کمائی کھاتے ہیں اور لوگوں کو راہ ہدایت دکھانے کی بجائے بدعت اور گمراہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

پیر زادیاں راہ نہ کوئی بھلے سدھے راہوں
دادے بابے دا ناں وٹیکن رہن دُور درگاہوں[1]
جاں خانے دی سار نہ ہووے تاں کیہ حاصل خانقاہوں
نوشہ کہے نہ کہے حقیقت جو کو رہے نہ چاہوں

مغل شہنشاہ اکبر نے ہندوؤں کو قریب لانے کے لئے مذہب کا جو حلیہ بگاڑا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ بقول ملک حسن علی:

''بادشاہ اسلامی عقائد و ارکان کا بھی، حشر و نشر، معجزات، عالم تکوین، دیدار الٰہی، ثواب و عذاب وغیرہ مسائل میں اسلام کے تمسخر اور استہزاء سے کام لیتا اور بھرے دربار میں اہل دربار سے ان مسائل پر بحث کرتا۔ یہ رنگ گہرا ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی زبان سے نبوت کبریٰ کے متعلق گستاخانہ کلمات نکلنے شروع ہو گئے۔''[2]

بقول ملا عبدالقادر بدایونی، کفار کی خوشنودی کی خاطر اکبر کو حضورﷺ کا نام لینا بھی گراں گزرتا تھا۔[3] علماء خطبہ لکھنے سے گزیر کرتے تھے اور خطبے میں حضور اکرمﷺ کا اسم مبارک لینے سے کتراتے تھے۔ وہ صرف اللہ اور بادشاہی القابات کا ذکر کرنا ہی

1- گنج شریف ص 394
2- ملک حسن علی: تعلیمات مجددیہ شرقپور 1965ء ص 42
3- عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ جلد 2 ص 215

کافی سمجھتے تھے۔ [1] حضور اکرم ﷺ کی نبوت پر کھلم کھلا اعتراض کرتے تھے۔ اور کسی کو دیوان خانے میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ نماز ، روزہ اور حج پہلے ہی ساقط قرار دیئے جا چکے تھے۔ [2] مورخین کے خیال میں اکبر کے گمراہ ہونے اور دین اسلام کو مذاق کا نشانہ بنانے کی تمام تر ذمہ داری اُس زمانے کے اُن علماء پر عائد ہوتی ہے، جو شاہی دربار میں محض اپنی برتری ثابت کرنے اور ایک دوسرے کی تضحیک اور توہین کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ شیخ محمد اکرام اُس عہد کے علماء کے کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اگر معاملہ ذاتی فضیلت جتانے اور ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل تک رہتا تب بھی شاید اکبر دین اسلام سے بدظن نہ ہوتا۔ لیکن علماء نے اہم مسائل پر اس قدر اختلاف کیا کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ ایک عالم ایک چیز کو حرام کہتا تھا۔ دوسرا اسکے حلال ہونے کا فتویٰ دیتا تھا۔ بادشاہ نہ صرف دونوں سے بدظن ہوگیا بلکہ حلال و حرام کی تعین ہی اس کے دماغ میں نہ رہی۔ اس منزل پر پہلا قدم ملا مبارک نے دکھایا اور وہ بھی ایک نازک ذاتی مسئلے پر۔ تفصیل اُسکی یہ ہے کہ بادشاہ کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ عبادت خانہ کے مباحثوں میں تعداد ازواج پر گفتگو ہوئی تو بادشاہ کو بھی خیال ہوا کہ کسی حرم کو رخصت کئے بغیر کسی طرح شرع کی پابندی ہو جائے۔ ایک دو نے متعہ کا راستہ دکھایا۔ دوسروں نے اُسکی حنفی فقہ کی رو سے مخالفت کی۔ اس پر ملا مبارک نے کہا اگر ایک مالکی قاضی اس کے حق میں اپنے اصول کی رو سے فتویٰ دے دے تو ایک حنفی کے لئے بھی متعہ جائز ہے۔ بادشاہ کو اور کیا

1- منتخب التواریخ جلد 2 ص 269

2- ایضاً ص 251

چاہیئے تھا۔ دربار سے حنفی قاضی کو رخصت کیا اور اسکی جگہ مالکی قاضی حسین عرب مکی کی تعیناتی ہوئی جس نے فوراً حسب الطلب فتویٰ دے دیا۔'' (1)

اکبر کے حواری ابو الفضل اور فیضی نے اکبر کو امام، مجتہد اور نبی بنانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اکبر نے خاموشی سے یہ تمام عہدے قبول کر لئے اور اپنے نئے دین کا نام دین الٰہی رکھا۔ فیضی نے اپنے ایک شعر میں اکبر کی نبوت کو اس طرح تسلیم کیا ہے:

شکر صد شکر کہ خیر البشرے پیدا شد
یک نبی رفت و پس او دگرے پیدا شد (2)

شاہی محل میں آتشکدہ بنایا گیا۔ علاوہ ازیں ہندوآنہ رسومات کا آغاز ہوا۔ تمام مذاہب کے اصول ملا کر ایک نیا مذہب ''دین الٰہی'' تشکیل دیا گیا۔ جس کا کلمہ تھا ''لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ'' السلام علیکم کی بجائے اللہ اکبر کے کلمات کو رواج دیا گیا۔ بادشاہ مندروں میں جا کر اپنے ماتھے پر تلک لگواتا تھا اور جنجو پہنتا تھا۔ بتوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا تھا۔ جب بادشاہ کی یہ حالت ہو تو پھر رعایا کا گمراہ ہونا کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔ اکبر کی موت کے بعد اسکے بیٹے جہانگیر نے بھی اسی ڈگر پر چلنا مناسب سمجھا:

''اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے باپ کی طرح اسی مزاج کا تھا۔ اس کے عہد میں اکبری بدعات اور لا مذہبیاں جاری رہیں۔ تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اکبر کے خلافِ شرع قوانین کو بجائے موقوف کرنے کے بدستور قائم رکھا۔ اکبر نے سجدے کو رواج دیا تھا۔ جہانگیر اہلِ دربار کی اس سجدہ ریزی میں

1- شیخ محمد اکرام: رود کوثر؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1958ء ص 85
2- تعلیمات مجددیہ ص 42

سعادت سمجھتا تھا۔"[1]

جہانگیر کے بعد شاہجہان کے دور میں اس فتنے پر قابو پانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پون صدی میں جس خاص اہتمام سے کفر اور اسلام کی کھچڑی پک چکی تھی اُسے زائل کرنے کے لئے بہت سا وقت درکار تھا۔ یہ کام کوہِ وستون سے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اکبر کے بعد جہانگیری عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دین الٰہی کے بُرے اثرات زائل کرنے میں بے حد محنت کی مگر جب اکبر و جہانگیری عہد کے الحادی اثرات نے شاہجہانی عہد کو متاثر کرنا شروع کیا تو حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے الحادی اثرات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہوں نے جہاں تبلیغ کے ذریعے دین اسلام کے اصل خدوخال کو سامنے لانے میں کوششیں کی وہاں اپنی شاعری کے ذریعے اُن لوگوں کے خلاف آواز بھی بلند کی جو دین اسلام کی اصلی شکل مسخ کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہر طبقے کے اُن لوگوں کو بے نقاب کیا جو دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے ذمہ دار تھے۔ آپ کی اس نظم میں اُس زمانے کے ماحول کی کمال عکاسی ملتی ہے:

نوشہ کہے سنو سچیارو کیہا ویلا آیا
مومن مرد نہ دسے کوئی سبھسے راہ بھلایا
دین اسلام دا چھڈ طریقہ بدعت نوں اُٹھ لگّے
کرن نہ حضرتؐ دا فرمودہ تاہئیں ڈھاہ ورگّے
جو اسلام تے قائم ہووے اُسنوں عیب لگاون
شرع چھڈ لگے بے دینی سرخود کار کماون
رلا کربلا پیا اجیہا سمجھ کجھ نہ آوے
ہندوواں مسلماناں رل مل بھرے خودی دے کھارے

1- تعلیمات مجددیہ ص46

کفر اسلام رل کھچڑی ہوئے مومن کوئی نہ دِسے
رل مل گئے طریقے سبھسے فہم نہ کیتا کسے
درویشاں درویشی چھڈی جوگ کماون چایا
چھڈ توحید الحاد نوں لگے دین دا طور بھلایا
جیہڑے واسطے حضرتؐ آئے سو کوئی کردا ناہیں
کلمہ بھرن تے کرن منافقی تنہاں ساڑن بھائیں
علماواں ابلاغ بھلایا پڑھن نہ حق دے کارن
بادشاہاں نوں دولت مُٹھا پیر کوہاڑا مارن
امر معروف نہی مُنکر دا اتے جہاد ونجایا
اگلا راہ محمدیؐ چھٹا ہن ہور راہ چلایا
مغز چھوڑ چھلاں نوں لگن سے حیوان کہاون
اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَل ھُمْ اَضَلُ داسے رتبہ پاون
چھڈے راہ پیغمبر والا تے راہ مخالف چلے
سو منزل نہ پہنچے ہرگز آپے کھاوے کھلے (1)

نوشہ صاحبؒ نے اپنی اس نظم میں صرف اُس ماحول کی ہی عکاسی نہیں کی بلکہ گمراہ ہونے والے لوگوں کو حق سچ کا راستہ دکھانے کا جتن کیا ہے۔ اس نظم کے آخر میں لکھتے ہیں:

مرشد سچے ایہہ فرمایا راہ حضرتؐ دے چلّو
جو کجھ کردے آہے حضرت اوہ طریقہ ملّو
ہکو آکھو ہکو منوں ہک دے ہوؤ خواہیں
اول آخر ظاہر باطن ہک بن ہور کو ناہیں

1- گنج شریف ص598

کلمہ حق دا ہکّو کلمہ کہے فقیر نوشاہ
لا الــہ الا الـلــہ مـحـمد رسول اللـہ (1)

چند نئے فنی کمالات

تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو نوشہ صاحبؒ کی شاعری میں کچھ نئے فنی کمالات بھی نظر آتے ہیں ان فنی کمالات کی بنا پر آپ اپنے ہم عصر شاعروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

1-اَٹ: اٹ اصل میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں قافیہ مصرع کے درمیان آتا ہے۔نوشہ صاحبؒ سے قبل کے شعراء اور ہم عصر شعراء کے ہاں اس صنف کا شاید کوئی وجود نہیں۔مگر نوشہ صاحبؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اَٹ دراصل دو مصرعوں کی ایسی نظم ہوتی ہے جس کا قافیہ مصرع کے آخر میں آنے کی بجائے مصرع کے درمیان میں آتا ہے۔ بظاہر یہ عجیب سی صنف لگتی ہے لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ نظم اپنے تأثر کے اعتبار سے کسی اور صنف سے کم نہیں ہے۔ایسی تمام اصناف شعری جن میں قافیہ مصرع کے آخر میں آتا ہے اپنے خاص صوتی آہنگ کی بنا پر پڑھنے سننے والے کو بہت جلد متاثر کر لیتی ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں قافیہ اور ردیف سے معرا نظمیں قارئین کو دیر سے متاثر کرتی ہیں۔ چنانچہ ایسی نظم لکھنا بے حد دشوار کام ہے۔جس میں قافیہ بھی نہ ہومگر تاثیر سے لبریز ہو۔اگر کوئی شاعر کوئی ایسی نظم لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس سے قاری متاثر ہواور ردیف قافیے کا اُسے خیال تک نہ آئے،تو وہ شاہکار بن جاتی ہے اور شاعر کے مکمل فنکار ہونے میں ذرا بھی شک نہیں رہتا۔ بلکہ اُس کے فن کو تسلیم کرتے ہی بن پڑتی ہے۔نوشہ صاحبؒ نے ایسی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔جن سے اُن کے پختہ فنکار ہونے کی شہادت ملتی ہے اور اُن کے فنی کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا

1- گنج شریف ص599

ہے۔صنف اَٹ کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

مرشد مرشد آکھ ، ایہو مرشد آکھدا [1]
نوشہ سچی ساکھ ، سچے مرشد پاک دی
ہکو مرشد من ، ہر ہر دی خادمی [2]
شک غیر دا بھن ، ہکو سائیں جان کے
مرداں خوف نہ غم ، نامرداں نت دکھڑے [3]
رکھ سکھالا دم ، آکھے نوشہ قادری
ہونا ہو سو ہوئے ، انہونا نہ ہووسی [4]
موڑے ناہیں کوئے ، پیر پیغمبر اولیئے

اَٹ کی صنف صرف نوشہ صاحبؒ کے کلام میں ہی دکھائی دیتی ہے۔اُن کے بعد کسی شاعر کے کلام میں یہ صنف دکھائی نہیں دیتی۔ ہوسکتا ہے کہ نوشہ صاحبؒ نے یہ صنف خود ہی ایجاد کی ہو۔ اس صنف میں کامیاب طبع آزمائی کرنا بے حد دشوار ہے۔ شاید اسی لئے شعراء نے اس صنف کو نہیں اپنایا۔ البتہ نوشہ صاحبؒ کے بعد چند ایک واروں میں کہیں کہیں اس صنف کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر نادر شاہ کی وار میں۔

2- **مانجھ:** یہ ایک چومصرعہ نما نظم ہے جس میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ردیف بھی ہوتی ہے۔لیکن عام طور پر ردیف نہیں ہوتی۔ اس نظم کا کمال یہ ہے کہ اگر اس کے چاروں مصرعوں کو الگ الگ پڑھیں تو ہر مصرع اپنی جگہ مکمل مضمون

1- گنج شریف ص214
2- ایضاً ص215
3- ایضاً ص245
4- ایضاً ص245

ادا کرتا ہے اور اگر چاروں مصرعے اکٹھے پڑھے جائیں تو پھر بھی مجموعی تاثر ایک جیسا اور ایک ہی مضمون بیان کرتے ہوں۔ باالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں فکر اور فن آپس میں باہوں میں باہیں ڈالے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یقیناً ایک مشکل صنف ہے لیکن نوشہ صاحبؒ نے ان گنت ''مانجھ'' نظمیں لکھی ہیں۔ جو اُن کے اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور رفعتِ تخیل کی عکاس ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ نظمیں دیکھئے:

ہوون ہار نہ مِٹے بھورا مورکھ کیوں کرلاوے [1]
کڑکن، کلپن، رووں ہسن، ایہہ بھی لیکھ کراوے
پیر پیغمبر پہنچ نہ اوتھے لیکھا کون مٹاوے
نوشہ کہے فقیر مولیٰ دا واہ جو مولا بھاوے

o

مرشد ہوئے لطف ملدا مرشد ہوئے لطیفہ
مونہہ مرشد دا مُصحف سچا ایہو صحیح صحیفہ
دم دم مرشد پاک صلاحیئے ہور نہ اساں وظیفہ
نوشہ مرشد سچاملیا حق دا پاک خلیفہ [2]

o

اساں کلمے دا آسرا کہے فقیر نوشاہ
نوشہ کلمہ آکھ لے ساہ دا نہیں وساہ
جے تیں کلمہ آکھیا تاں اگلا غم نہ کھا
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ [3]

1- گنج شریف ص245
2- ایضاً ص229
3- ایضاً ص482

مولا سچا مرشد سچا جو سچا تس پایا[1]
اول آخر ظاہر باطن سچے سچ دھیایا
سچ دھیائے سو حق پائے حق سچ سمایا
نوشہ تنہاں دے پیریں لگا جنہاں حق نوں سیس نوایا

o

پنجابی غزل کے پہلے شاعر

پنجابی زبان میں غزل کی ابتداء کب ہوئی اور پہلا غزل گو کون تھا؟ اس کے متعلق مختلف آرا سامنے آتی ہیں۔ کسی نے شاہ مراد [2] (جنم اور وفات بارھویں صدی ہجری [3]) کسی نے میاں محمد بخش [4] (مصنف سیف الملوک) اور کسی نے نواب غلام حسین عرف گاموں خاں [5] کو پہلا غزل گو ظاہر کیا ہے۔ کسی کی رائے ہے کہ سید وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، نواب گاموں خان، موسیٰ لدھیانوی اور مولوی دلپذیر نے غزلیات لکھیں۔ [6] لیکن نوشہ گنج بخشؒ کی شاعری سامنے آنے پر مذکورہ تمام آراء غلط ثابت ہوئیں۔ کیونکہ اُن میں سے کوئی ایک بھی شاعر نوشہ گنج بخشؒ کے دور کا نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُن سے پہلے کا کوئی شاعر ہے۔ حضرت نوشہ صاحبؒ نے جہاں اَٹ اور مانجھ جیسی نئی شعری اصناف کو پنجابی شاعری سے روشناس کرایا ہے وہاں انہوں نے غزل کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اگرچہ انہوں نے اِس صنف کو غزل کا نام نہیں دیا۔

1- گنج شریف ص 335
2- عارف عبدالمتین: پرکھ پڑچول؛ جدید ناشرین اردو بازار لاہور 1979ء (دیباچہ)
3- مولا بخش کشتہ: پنجابی شاعراں دا تذکرہ؛ کشتہ اینڈ سنز ٹمپل روڈ لاہور 1960ء ص 152
4- اقبال صلاح الدین: (مرتب) لعلاں دی پنڈ؛ عزیز بکڈپو اردو بازار لاہور 1973ء ص 121
5- ایضاً
6- پروین شاہ دین: مشمولہ مضمون لعلاں دی پنڈ ص 131

لیکن حقیقت میں وہ غزل ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نوشہ صاحبؒ عربی، فارسی کے عالم تھے اور فارسی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے فارسی غزل کے اعلیٰ نمونے موجود تھے۔ اس لئے انہوں نے فارسی غزل کی تقلید میں پنجابی میں خوبصورت غزلیات لکھیں۔ غزل کی خواہ کوئی بھی تعریف کی جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ غزل کا دامن بے حد وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے موضوعات میں بوقلمونی پیدا ہو چکی ہے۔ اب غزل کی تعریف کو الفاظ میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے نوشہ صاحبؒ کی مندرجہ ذیل نظم کو بھی غزل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نوشہ صاحبؒ نے فارسی شاعری سے صرف غزل کی ہئیت مستعار لی ہے، لیکن اسکے مضامین یکسر مختلف ہیں۔ یوں انہوں نے آج سے تقریباً تین سو سال قبل غزل کے دامن کو وسعت بخشنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی ایک غزل دیکھئے جس میں مطلع اور مقطع کا اہتمام بھی ہے:

سچا آپ خدا ہے سچی سچ خدائی — سب خلقت درکار ہے بیکار نہ کائی [1]
جیں ول ویکھیں نظر بھر نہیں حکمتوں خالی — رتناں اندر ہے نہیں جو گُن وچ رائی
او تھے دم نہ ماریئے سر سجدے دھریئے — چوں چرا دی تھاں نہیں بندے چترائی
من دیاں لہراں میٹ لے پھر اگے چلیں — حیلے کِتے نہ میٹیئن لہراں دریائی
پیش نہ جاوے اپنا کجھ اپنے اگے — قادر اگے عاجزی کیہی وڈیائی
کم نہ اُس دے لکھیئن اوہ کتھوں لکھیں — عقل نہ پاوے گُن نوں ایہو دانائی
فکر نہ کریئے ذات دا ویکھاں کیہ ہوسی — گلاں چھڈ نکمیاں کر نیک کمائی
اللہ ہک پچھان لے نال اسماں صفتاں — من لے حُکم درگاہ دے جیوں حکم ہویائی
من محمد مصطفےٰ ﷺ سچا پیغمبر — نوشہ مرشد منیاں من ہوئی صفائی

1- گنج شریف ص 354

لمبی بحر کی یہ غزل دیکھئے جو ہر اعتبار سے غزل کے مزاج پر پوری اترتی ہے:

ہک پل سُکھ نہ آوے تدھ بن ہک پل سُکھ نہ آوے
پل پل دوروں آہیں بھراں سے غوطے جی کھاوے

تیرے ویکھن نوں جی ترسندا اوکھا ملن نماناں مندا
کیہ کجھ کرے نمانا بندہ جے صاحب ایویں بھاوے

پھاتھا وچ وچھوڑا جانی نگل گئی دوسلّو کانی
جھب پڑھے کوئی آسانی کویں جند نکل جاوے

نوشہ کہے فقیر الٰہی بیا جیو اوّلی پھاہی
ایہہ گل لیکھیں لکھی آہی، جوں بھی سُکھ نہ پاوے (1)

اس کے علاوہ غزل میں کئی شعر ایسے بھی ہیں جن کا ہر ایک شعر ہم قافیہ اور ہم ردیف ہے۔ لیکن ان غزلیات کے مضامین زیادہ تر رب، رسول ﷺ اور مرشد کی صفت وثناء سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں یادؔ عنوان کی ایک غزل خاصے کی چیز ہے جس کے بیس اشعار ہیں۔ اس غزل میں وحدت الوجود کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار دیکھئے:

واہ وا صاحب سچا توں باقی ہور سب فنا (2)
صفت ناد مہانا مرشد وحدت بے اوڑک دریا

ایک انیک سپنے وچ ہویا سپنے جمیاں سپنے مویا
جاگے ہور نہ کوئی ڈِٹھا ہور ہووے تاں ویکھے ہا

1- گنج شریف ص359
2- ایضاً ص435

نہ کجھ ہویا نہ کجھ ہووے سپنا ہسے سپنا رووے
سپنا اندر کل ورتارا جل تھل سپنا ورت رہیا

واہ خدا واہ وا خدائی آ کھ نہ سکاں تِل وڈیائی
ڈھائی اکھر پریم دے نوشہ مرشد دتے آپ پڑھا

ایک اور غزل دیکھئے جن میں مرشد کے عشق کے حوالے سے ربی یاد کا پیغام دیا ہے:

ہوراں محنت روزے چلّے ،نفلاں جوگ ورتارا[1]
کیتا مرشد پاک اساڈا کلمے نال چھٹکارا

زہد ریاضت زاہد کردے کرن عبادت عابد
مہر محبت ذکر کلمے دا ایہو اساں سہارا

ہوراں محنت کرکے پایا اساں ملایوس آپے
راہاں دی تِس حاجت ناہیں جس دا راہ نیارا

رنڈی پیہنا کتنا کردی سُتی سیج سہاگن
مرشد جس دا قدرت والا سو کیوں پھرے آوارا

ہکناں ذاتاں تے وڈیائی ہکناں تکیہ عملاں
اساں مرشد دا عشق کمتا پاسا ساڈا بھارا

کوئی کہے میں شیخ قریشی کوئی کہے میں سید
کوئی کہے میں اہل حکومت میرا وڈ پیارا

1- گنج شریف ص500

کوئی کہے میں وڈا تونگر دولت دنیا مالوں
زمیندار کہاوے کوئی سوداگر ونجارا

یاد بناں اساں ہور نہ جاتا ، جاتا ہِکّو خاوند
پیر پیغمبر اس دے یادی نوشہ کون وچارا

غزل کے ان نمونوں سے پتا چلتا ہے کہ نوشہ صاحبؒ کو غزل کی صنف پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن اُن کا شاعری کرنے کا مقصد توحید باری تعالیٰ کا پرچار اور لوگوں کو صراط مستقیم دکھانا تھا۔ اسلئے انہوں نے غزل کی ہیئت میں کہے ہوئے اشعار پر غزل کا عنوان لکھنے کے بجائے یاد، نادیا یادشہانا کے عنوانات لکھ دیئے۔ نیز یہ کہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ نوشہ صاحبؒ سے پہلے غزل موجود تھی۔ کیونکہ نوشہ صاحبؒ سے پہلے حضرت بابا فریدؒ اور شاہ حسینؒ کے کلام میں کہیں بھی غزل کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر نوشہ صاحبؒ کے ہم عصر شعراء حضرت سلطان باہوؒ اور عبداللہ عبدی کے کلام کو دیکھیں تو اُن کی شاعری میں غزل کا کہیں کوئی نشان نہیں۔ چنانچہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نوشہ صاحبؒ نے پہلی مرتبہ پنجابی شاعری کو غزل جیسی خوبصورت صنف سے متعارف کرایا۔

کافی

پنجابی شاعری کی معروف اور مقبول صنف کافی ہے۔ جسے صوفی شعراء نے اپنے دلی جذبات اور صوفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ پنجابی میں کافی لکھنے والے سب سے پہلے اور بڑے شاعر شاہ حسینؒ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ شاہ حسینؒ کی کافیاں آج بھی اُسی طرح مقبول ہیں جس طرح اُن کے اپنے زمانے میں تھیں۔ نوشہ گنج بخشؒ پنجابی کافی کے دوسرے بڑے شاعر نظر آتے ہیں۔ اُن کی کافیوں میں تقریباً وہی مضامین بیان ہوئے ہیں جو اُن کی عام شاعری میں موجود ہیں۔ شاہ حسینؒ کی کافیوں میں عاجزی، انکساری، محبوب حقیقی کے ہجر کی تڑپ اور وصال کی چاہت جیسے

مضامین موجود ہیں۔ نوشہ صاحبؒ کی کافیوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس صنف میں شاہ حسینؒ سے متاثر ہیں۔ انہوں نے کافی لکھنے کا انداز بلاشبہ شاہ حسینؒ سے حاصل کیا ہے جبکہ مضامین اُن کے اپنے ہیں۔ البتہ الفاظ کا اشتراک کہیں کہیں ایک جیسا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لئے شاہ حسینؒ اور نوشہ صاحبؒ کی کافیوں کا موازنہ ضروری ہے۔
شاہ حسینؒ کی کافی ہے:

اک دن تینوں سپنا تھیسن گلیاں بابل والیاں وو[1]
اُڈ گئے بھور پھلاں دے کولوں سن پتراں سن ڈالیاں وو
جت تن لگے سو تن جانے ہور گلاں کرن سکھالیاں وو
رہ وے قاضی دل نہیوں راضی گلاں ہویاں ہوون والیاں وو
سوئی راتیں لیکھے پوسن جو نال صاحب دے جالیاں وو
ناؤں حسین تے ذات جولاہا گالیاں دیندیاں تانیاں والیاں وو

شاہ حسینؒ کی ایک اور کافی ہے:

نی سیو مینوں ڈھول ملے تاں جاپے[2]
برہوں بلائے گتھی تن اندر میں آپے ہوئی آپے
سِکن دُور نہ تھیوے دل توں ویکھن نوں من تاپے
کہے حسین سہاگن سوئی جاں شوہ آپ سنجھاپے

ایک اور کافی میں فرماتے ہیں:

نی تینوں رب نہ بھُلے ، دعا فقیراں دی ایہا[3]
رب نہ بھُلی ہور سب کجھ بھُلی ، رب نہ بھُلن جیہا

1- کافیاں شاہ حسین؛ مجلس شاہ حسین لاہور 1976ء ص 24
2- ایضاً ص 27
3- ایضاً ص 40

ہجر اور دُکھ کے احساس کی ایک کافی کے کچھ بول یوں ہیں:

راتیں درد دہیں درماندی ، مرن اساڈا واجبی وو[1]
لٹاں کھول گلے وچ پائیاں میں بیراگن آودی وو
جنگل بیلے پھران ڈھونڈیندی کوک نہ سکاں ماری لاج دی وو
کہے حسین فقیر سائیں دا رات دہیں میں جاگدی وو

اس کے مقابلے میں نوشہ گنج بخش کی کافی کا مزاج دیکھئے:

رب سمھال پیاریا وو توں رب سمھال پیاریا وو[2]
جو دم خوشیاں نال وہاوے سو دم بھال پیاریا وو
سدا سدا رہ خوشیاں کردا غم دکھ ٹال پیاریا وو
ایہہ دنیا بے دید نموہی چلے نہ نال پیاریا وو
چلے نال کلمہ حضرت دا کرے نہال پیاریا وو
نوشہ مرشد توں بل جائے جیں دتا حال پیاریا وو

شاہ حسینؒ کی کافیوں میں حقیقت ازلی سے ملاپ کی بجائے ہجر وفراق کا درد اور وصال کی تمنا ہے۔ یہی تمنا اور آرزو اُن کو ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں نوشہ صاحبؒ کی کافیوں میں خاص ٹھہراؤ ، اطمینان، سکون اور حقیقت ازلی کو پا لینے کی سرمدی کیفیت موجود ہے۔ جو پڑھنے اور سننے والے کو اپنے تاثراتی سحر مین جکڑے رکھتی ہے۔ ایک کافی کے بول یوں ہیں۔

ہر ہر حالوں لدھا ، لدھا ہر ہر قالوں[3]
حال ، قال تھوں باہر ناہیں لدھا اہل کمالوں

1- کافیاں شاہ حسین ،مجلس شاہ حسین لاہور 1976ء ص 24
2- گنج شریف ص 227,28
3- ایضاً ص 328

کامل اوہ جر ہر وچ ویکھے صدقوں وہم خیالوں
دسے مرشد دے چھٹے نوشہ اسیں جواب سوالوں

عام طور پر کافی میں کوئی ایک خیال نہایت دلکش انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جسے پڑھنے یا سننے کے بعد اُس خیال یا موضوع کے متعلق کوئی تشنگی نہیں رہتی۔ ورنہ وہ کافی کہلانے کی حقدار نہیں۔ کیونکہ کافی کا مطلب ہی یہی ہے کہ اُس کے سننے سے مکمل تسکین و اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس لئے ہر شاعر کافی نہیں لکھ سکتا۔ کافی لکھنے کے لئے وسیع علم، گہرا مطالعہ، پختہ تجربہ اور فن شاعری پر عبور حاصل ہونا بے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کیلئے موسیقی کے علم سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ نوشہ صاحبؒ کی کافیوں کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ یہ تمام خوبیاں ان میں بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ جس خیال کو پیش کرنا چاہتے ہیں اُسے نہایت سلیقے اور قرینے سے کافی کے قالب میں سموتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے پر انہماک اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ کافی سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔ آپ کی ایک ایسی کافی کا ایک حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جس میں نہایت منطقی انداز میں توکل الی اللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کافی کا آپ نے عنوان ''صدق نامہ'' تجویز کیا ہے:

سچی آس اساسا اساں سچی آس اساسا[1]
سچی آس اساسا
سیل سلا وچ کیڑا پایا اس دا رزق اوتھے پہنچایا
اس صاحب نوں ہردا آہر شک نہیں وچ ماسا
سچی آس اساسا
کونجاں سو کوہیں اڈ جاون انڈے بچے نال نہ لیاون

1- گنج شریف ص345

اوہ کتھوں چکن کون چگاوے ایہہ وڈا دھرواسا
سچی آس اساسا
مچھی ہووے وچ دریاوے انڈے پانی اندر پاوے
بچے اُس دے ملن نہ اسنوں سبھسے اپنا واسا
سچی آس اساسا
مائی بابا پتر دھیاں جورو چاکر خاوند میاں
کوئی کسے تے دھریا ناہیں دل نوں دے دلاسا
سچی آس اساسا
ہر ہر رزق سنبھالے رازق آپے خلقے آپے خالق
نوشہ خاوند ہکو سبھناں کون عام کون خاصا
سچی آس اساسا، اساں سچی آس اساسا، سچی آس اساسا

نوشہ صاحبؒ کے کلام میں انسان کو زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے اور پھر اُس کے ذریعے خالق حقیقی تک پہنچنے کا درس موجود ہے۔ اس مضمون کو آپ نے مختلف انداز اور طریقوں سے بیان کیا ہے اور بالآخر اسی بات پر زور دیا ہے کہ انسان بندگی، عبادت وریاضت سے بلند درجات حاصل کرتا ہے۔ بندگی میں ہی اُسکی معراج ہے اور بندگی کے ذریعے ہی انسان اپنے خالق و مالک کو ہر وقت یاد رکھ سکتا ہے اور اُس کا شکر ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ کوئی بندہ میرے طرف ایک قدم چلتا ہے تو میں دس قدم اُسکی طرف بڑھتا ہوں۔ جب کوئی بندہ سچے دل سے مجھے پکارتا ہے تو میں اسکی ضرور سنتا ہوں اور مجھے بندے کی عاجزی اور انکساری بے حد پسند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبران خدا مقبول اور معصوم ہونے کے باوجود ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مصروف رہتے تھے اور آخری سانس تک حق بندی ادا کرتے رہتے تھے۔ باایں ہمہ یہ کہتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' نوشہ صاحبؒ

ایک سچے انسان، پرہیز گار صوفی اور درویش تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے دین کی تبلیغ اور لوگوں کو صراط المستقیم دکھانے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں بندگی، عبادت اور ریاضت پر روز دیا۔ نوشہ صاحبؒ کی کافیاں ان کے مشن و نظریات و عقائد کی مکمل ترجمان ہیں۔ انہوں نے کافی کے مضمون اور مزاج کے مطابق اُس کا عنوان قائم کیا ہے اور ساتھ ہی کافی کے راگ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ راگ گوری میں ایک کافی ملاحظہ ہو:

بندے کر لے یاد الٰہی

جس تھوں شاہ پت شاہ اکھاون تس دی سچی بادشاہی [1]

پیر پیغمبراں یاد کمتی ہک پل غافل ناہے
بندے سوئی کار کماون جو خود خاوند چاہے
یادی جیہا ہور نہ کوئی جو یادی سو جانے
یاد برابر راج نہ دولت یادی موجاں مانے
یادکرندے سچے بندے غافل مندے گندے
دنیا دار دُکھی دکھیارے یادی سکھ وسندے
یاد الٰہی سچ دی واہی سچ تے سچ گواہی
نوشہ کہے فقیر الٰہی کرلے یاد الٰہی

بحور کا استعمال

عام مشاہدے کی بات ہے کہ شاعر اپنی موزونیٔ طبع کے باعث روانی میں شعر کہہ جاتا ہے۔ اُسے وزن اور بحر پر عبور حاصل نہیں ہوتا۔ وہ صرف شعر کہہ سکتا ہے۔ شعر کی تقطیع نہیں کر سکتا۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علم عروض بے حد مشکل ہے۔ جسے

1- گنج شریف ص 447

سیکھنا اور سکھانا دونوں مشکل کام ہیں۔ اس علم کو سیکھنے کے لئے بہت زیادہ مطالعے ، تجربے اور مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انگریزی دور سے قبل ہندوستان کے اکثر مدارس میں دیگر علوم کے ساتھ علم عروض کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لئے ان مدارس میں تربیت پانے والے شعراء اس علم وفن سے بخوبی آ گاہ ہوتے تھے۔ چنانچہ صوفیائے کرام کے کلام میں بحور میں تنوع اس امر کی دلیل ہے۔ نوشہ گنج بخشؒ صرف موزونی طبع کی بنا پر ہی شعر نہیں کہتے تھے بلکہ آپ وزن، بحر اور علم عروض کی تمام باریکیوں سے کماحقہ آ گاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام محض چند ایک بحور کے استعمال تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ نے متنوع اقسام کی بحور میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ بلاشبہ پنجابی شاعری کی بحریں، عربی ، فارسی اور اردو بحور سے مختلف ہیں۔[1] پنجابی میں پنگل اور ماتروں کا نظام مروج ہے۔ جبکہ عربی بحور میں مخصوص ارکان مستعمل ہیں۔ نوشہ صاحبؒ کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ پنجابی بحروں کا بخوبی علم رکھتے تھے اور اس کے علاوہ عربی بحروں پر بھی عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے عربی بحروں میں پنجابی شاعری کی ہے۔ اُس دور میں یہ ایک نیا تجربہ تھا جس میں آپ مکمل طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ نے پنجابی، عربی اور ہندی کی مجموعی طور پر 34 بحریں استعمال کی ہیں۔ سب سے پہلے ہم ان اشعار پر نظر ڈالیں گے جو عربی بحروں میں کہے گئے ہیں۔ تاکہ واضح ہو سکے کہ نوشہ صاحبؒ اس فن میں کہاں تک عبور رکھتے تھے۔

عربی بحور میں سے آپ نے زیادہ تر شعر بحر متدارک میں کہے ہیں۔ اس بحر کو بحر غریب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مزید کئی اقسام اور شاخیں بن جاتی ہیں۔ لیکن نوشہ صاحبؒ نے اس بحر کی ایک قسم متدارک مثمن مقطوع میں زیادہ تر شعر کہے ہیں۔ بحر متدارک مثمن مقطوع کی بنیاد اصل میں بحر متدارک مثمن سالم ہی ہے۔ جس میں فعلن ''رکن'' سولہ مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی شعر کے ہر مصرعے میں فعلن آٹھ

بار آتا ہے مگر جب اس کی صورت متدارک مثمن مقطوع بن جاتی ہے تو شعر میں آٹھ بار ''فاعلن'' کا رُکن آتا ہے یعنی فاعلن ہر مصرع میں چار مرتبہ آئے گا اور جہاں فعلن کے ارکان کے ساتھ فاعلن استعمال ہوگا، وہاں اُسے بحر متدارک ہی کہتے ہیں۔ حضرت نوشہ صاحبؒ کی ایک نظم اتفاق پروان خالصتاً اسی بحر میں ہے اور اسکی تقطیع بحر متدارک مثمن مقطوع کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ جیسے

مُلّاں سیّد جٹ تَرے رل کے باغ گئے
میوہ کھادا لٹ کے کھا کے بہہ رہے

اس کا وزن یوں ہے:

فِعْلُنْ فِعْلُنْ فَاعِلُنْ فِعْلُنْ فِعْلُنْ فِعْ

اسکی تقطیع یوں کی جاسکتی ہے:

مصرع اولیٰ:	فعلن	فلعن	فاعلن	فعلن	فعلن	فع
	مُلاّ	سیّد	جٹ تَرے	رل کے	باغگ	اے
مصرع ثانی:	فعلن	فعلن	فاعلن	فعلن	فعلن	فع
	میوا	کھادا	لٹ ک اے	کھا کے	بہ رہ	اے

اسی طرح نظم ''اخلاق پروان'' میں فعلن چھ مرتبہ اور فعل ایک بار استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے:

درویشی اخلاص پیارے درویشی اخلاص
میں میں چھوڑے مانا توڑے سوئی بندہ خاص

اس شعر کی تقطیع یوں کی جاسکتی ہے:

فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعل
دروے	شی اخ	لاصپ	آرے	دروے	شی اخ	لاص
مے مے	چھوڑے	مانا	توڑے	سوای	بندہ	خاص

نظم ''دنیا دار اچاری'' کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

نوشہ ویکھ تماشا ایس جہان دا
قدرت دا بناؤ صاحب سلطان دا

اس شعر کی تقطیع یوں کی جا سکتی ہے:

فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فاعلن
نوشہ	دیکھت	ماشا	اے سج	ہان دا
قدرت	دابن	اوصا	حب سل	طان دا

بعض مقامات پر حضرت نوشہ صاحبؒ نے بحر متدارک مثمن مقطوع میں بہت کم ارکان استعمال کر کے چھوٹی بحر استعمال کی ہے:

سچا ہک خدا جس دا سب بنا

ایہدے تقطیع وچ صرف دو رُکن آؤندے نیں:

فِعْلُن	فَاعِلُن
سچا	ہک خدا
جس دا	سب بنا

آپ نے اپنے کلام میں جو عربی بحریں استعمال کی ہیں۔ اُن میں سے دوسری اہم ''بحر رمل مسدس محذوف'' ہے۔ اس کے ارکان فاعلاتن ، فاعلاتن فاعلن ہیں۔ مثلاً

رب دے دربار کر لے عاجزی
عاجزی کر یار کر لے عاجزی

تقطیع:

فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن
رب دے در	بار کر لے	عاجزی
عاجزی کر	یار کر لے	عاجزی

جہاں تک آپ کے کلام میں مقامی بحور کے استعمال کا تعلق ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو ''وار'' کی بحر بہت پسند ہے۔ اس لئے آپ نے بہت سی نظمیں وار کی بحر میں لکھی ہیں۔ پنجابی میں وار ایک عوامی یا لوک صنف ہے۔ جو کسی بہادر کی بہادری کی تعریف وتوصیف کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔لیکن نوشہ صاحبؒ نے اس بحر میں نہ تو کسی بہادر شخص کی بہادری کی تعریف کی ہے اور نہ ہی کسی دنیا دار کا قصیدہ لکھا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس رواں دواں، ناچتی گاتی بحر سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیا ہے۔ اور اس بحر میں انہوں نے ایسی خوبصورت منظومات تخلیق کی ہیں جن میں رب، رسولؐ اور مرشد کی مدح، نعت اور منقبت بیان کی ہے اور اُن کے احکامات کی پیروی کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اُن کی اس بحر میں لکھی ہوئی ایک نظم زروَیر پروان میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

بندے خالق یاد کر جس خلق اُپائی — من محمد مصطفیٰ سچیار خدائی[1]
کلمہ آکھ رسولؐ دا ہو مومن خاصا — اللہ اتے رسول تے دھر سچ بھرواسا
سچے حکم اللہ دے منے سو تریا — اوہو سچا آکھیئے جیں کلمہ بھریا
سچا مرشد پاک ہے جس بول سچاویں — مرشد دے سچیار سَے جو اللہ ناویں
مال دُنی دار نوں وڈیائی ماناں — ننگیں پیریں چلیا تاں پچھوں تاناں
تس صاحب نوں یاد کر جو ہت ہت ساتھی — ساتھ نہ چلے مال دھن تن گھوڑے ہاتھی
دنیا خواب خیال ہے اس جی نہ لاویں — سانبھ لئیں درویش دی تاں سوجھی پاویں

آپ اس بحر کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ اسلئے آپ نے اسے جنگی مقاصد کیلئے استعمال کیا ہے۔ مگر آپ نے کسی بہادر کی تعریف لکھنے کی بجائے اسلام کی خاطر جان قربان کرنے والے شہیدوں اور غازیوں کا مجموعی ذکر کرتے ہوئے اپنے تبلیغی مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ کی ایک نظم ''یادشہانا'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

1- گنج شریف ص 260,61

غازی ولی خدائے دا حضرتؐ فرمایا　　اوہ بہشتی ہویا جیں جنگ کمایا[1]
اول کلمہ فرض ہے پھر جنگ کماون　　جنہاں جنگ کمایا سے بہشتیں جاون
گھوڑے تے ہتھیار نال آیا پیغمبر　　دین اسلام چلایا کر سچ اڈنبر
مارے گڑھ کفار دے بُت سبھے توڑے　　چڑھدے لہندے چار کونٹ دوڑائے گھوڑے
کلمہ پاک پڑھایا کفر شرک گوایا　　سدھے راہوں گھتھیاں نوں راہ لگایا
نوشہ کلمہ آ کھیئے تے جنگ کمایئے　　کلمہ تے ہتھیار نال نت نت مونہہ لایئے

حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے وار کی کئی ایک اور بحور کے علاوہ لوک گیتوں میں سے ڈھولا اور دوہڑے کی بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں۔نمونے کے طور پر ڈھولے کی بحر میں ایک شعر دیکھئے:

کھایئے حق حلال سچ کہیئے جھوٹ چھڈیئے حرام نہ چاکھیئے[2]
سچے مرشد پاک محمدؐ اُتے ہوتن صدقے پت راکھیئے

اسی طرح دوہڑے کی بحر کا نمونہ دیکھیئے:

اساں اوٹ محمدؐ صاحب دی گڑھ کوٹ کلمہ دے آوڑے[3]
پاک محمدؐ رسول نے جی جھنڈے عرش مجید تے خوب جڑے

باجھ مریداں پیر نہ سوہن پُتاں باجھ نہ ماپے[4]
نوشہ نال مل طالب سنجھاپن مرشد طالباں نال سنجھاپے
نوشہ مرشد دے ملے دکھ نہ رہندا کوئے
آون ہو سگار تھا جاون سوہنا ہوئے[5]

1- گنج شریف ص289
2- ایضاً ص383
3- ایضاً ص 186
4- ایضاً ص209
5- ایضاً

ہکو جیئے جانیئے نوشہ شیر فقیر[1]

ایہہ مردار نہ کھاوندے توڑے ہون زہیر

طویل بحر میں ہر ایک شاعر شعر کہہ لیتا ہے لیکن چھوٹی بحر میں شعر کہنا بے حد دشوار کام ہے۔ کیونکہ طویل بحر کے مقابلہ میں جہاں اُس کا کنوس بہت چھوٹا ہوتا ہے وہاں الفاظ کے انتخاب میں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا کم سے کم الفاظ اور سخت زمین میں اپنے خیالات کی ترسیل دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ چھوٹی بحر میں شعر لکھنے کے لئے جہاں وزن اور بحر سے واقفیت بے حد ضروری بے حد ہے وہاں الفاظ کے لغوی معنی کے علاوہ اُن کے اندر چھپے ہوئے اصطلاحی معنوں کے ساتھ ساتھ اُن کے پس منظر سے بھی شناسائی ناگزیر ہے۔ تب ہی ایک شاعر بہترین شعر کہہ سکتا ہے اور دریا کو کوزے میں بند کر سکتا ہے۔ چھوٹی بحر میں روانی کیساتھ وہی شاعر شعر کہہ سکتا ہے جسے اس فن پر عبور حاصل ہو۔ نوشہ صاحبؒ نے بہت نظمیں چھوٹی بحر میں لکھی ہیں۔ اُن کے یہ چھوٹے چھوٹے مصرعے اپنے اندر وسیع لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ بے حد تاثراتی خوبی بھی رکھتے ہیں۔ نوشہ صاحبؒ کو چھوٹی بحر میں شعر کہنے کی کس قدر مہارت حاصل تھی، اس کا اندازہ اُن کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

راہ فقیری مل سدھے راہے چل[2]

ایہہ گل رکھیں چت رہنا ناہیں نت

اساں منیا رب رسول سب کیتے حکم قبول

پڑھ کلمہ پایا دین اس اُتے اساں یقین

اسی طرح ''تگ'' کے عنوان سے آپ کی تریسٹھ اشعار کی چھوٹی بحر میں ایک نظم بہترین نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ جس سے چند اشعار یوں ہیں:

1- گنج شریف ص 313

2- ایضاً ص 269

نوشہ کہے پکار　　سن پیارے سچیار[1]
دنیا سندی چاہ　　پل پل ودھدی جاہ
مرشد دی سن مت　　اندر جھاتی گھت
نبھے نہ ہور کجھ نال　　دم دم رب سنبھال
اول آخر اوہ　　باطن ظاہر اوہ
اوتھے اِتھے اوہ　　جتھے کتھے اوہ
مالوں دے زکوٰۃ　　ہووے ترت نجاۃ
فانی ہور تمام　　دنیا کُوڑ مقام
چلن دا کر ساز　　پڑھ لے پنج نماز
روزے رکھ تریہہ　　ایہو سدھی لیہہ
کرکے حج ادا　　کلمہ آکھ سدا
دل تے رکھ یقین　　جو ثابت ہووے دین

نوشہ صاحبؒ نے چھوٹی بحر کے علاوہ سخت زمینوں میں بھی کامیاب شاعری کی ہے۔اُن کی ایک نظم موج لہر ملاحظہ کیجئے۔

توں کہہ لے مرد فقیرا آئے واہ وا　　توں کرلے مرد فقیرا آئے واہ وا
اساں پایا صاحب سکھیرا آئے واہ وا　　مونہہ داڑھی سر تے چیرا آئے واہ وا
اوہ آئے دھیرا دھیرا آئے واہ وا　　کہہ نوشہ گنیں گوہیرا آئے واہ وا
کہہ توں گھر گھمبیرا آئے واہ وا[2]

نوشہ صاحبؒ کے کلام میں رواں دواں بحروں کی بھی کمی نہیں۔آپ کے کلام میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں۔جن میں بہتے ہوئے دریا کی سی روانی ہے۔اس روانی و سلاست

1- گنج شریف ص158,59
2- ایضاً ص366

سے جہاں شاعر کے مزاج کا پتا چلتا ہے، وہاں صوتی اعتبار سے موسیقی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ جو قاری پر جادوئی اثر کرتی ہے۔ مثلاً:

کُتے دا کم بھونکنا بدی کرے بد گو　　چپ کم فقیر دا، اگوں اللہ کرے سو ہو [1]

چوہڑا لنگھے راہ جس گندی دیوے باس　　نوشہ عطری لنگھیاں عطر دی آئے ہولاس

مندیاں نوں قدر کیہ بھلیاں دی نوشاہ　　کُتا ویکھ فقیر نوں بھونکے واہو واہ

اس سے بڑھ کر رواں دواں بحر کی اور کیا خوبصورت مثال ہوسکتی ہے:

درویشی کل خیر پیارے درویشی کل خیر [2]

ناں درویشاں بغض بخیلی نہ درویشاں ویر

مرد درویش اس دنیا اندر آئے کرنے سیر

درویشاں حق ہک پچھاتا جاتا ناہیں غیر

نوشہ کہے فقیر قادر دا درویشی کل خیر

درویشی کل خیر پیارے درویشی کل خیر

وزن بحر اور الفاظ کے انتخاب نے نوشہ صاحبؒ کے کلام میں موسقیت پیدا کر دی ہے۔

موسیقی کا عنصر

موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور عمدہ شاعری کی صفات اُس وقت کھل کر سامنے آتی ہیں جب موسیقی کے کومل کومل سُر اور اُن کے اندر چھپی ہوئی نزاکتیں اور بھرپور تاثر پیدا کرنے والی خوبیاں واضح انداز میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک اعلیٰ شاعر کے عمدہ کلام کی یہی خوبی شمار کی جاتی ہے کہ اُس کا کلام موسیقی کے

1- گنج شریف ص552

2- ایضاً ص321

فن پر یوں پورا اترے کہ اُسے آسانی سے گایا جا سکے۔ پنجابی شاعری کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اُس نے بزرگوں، صوفیوں اور شاعروں کے دامن میں پرورش پائی ہے جو ایک طرف بلند مرتبہ شاعر تو دوسری طرف علم موسیقی کے ماہر تھے۔ انہوں نے موسیقی کے علم کی باریکیوں کو بطریق احسن سمجھا پھر اُس میں کئی ایک قابل قدر اضافے بھی کئے۔

پنجاب میں موسیقی کے فن کو مغل شہنشاہ اکبر کے دور (1556ء تا 1605ء) میں عروج حاصل ہوا۔ اسکی بڑی وجہ شاہی دربار کی سرپرستی تھی۔ اکبر کے دربار میں ایرانی، ترکی، تورانی، کشمیری اور مقامی ہندو موسیقاروں کا ہجوم تھا۔ اُن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ان موسیقاروں کو سات گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر روز ایک گروہ بادشاہ کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خود بھی موسیقی کا ماہر تھا۔ وہ کئی ایک ساز خود بھی نہایت مہارت کیساتھ بجا لیتا تھا۔ اُس کے نورتنوں میں عبدالرحیم خان خاناں کے علاوہ مان سنگھ، راجہ بھگوان داس، بیجو باورا اور تان سین جیسے ماہرین موسیقی موجود تھے جو اس فن پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کی اس سرپرستی سے موسیقی کے فن کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور عوامی سطح پر بھی اس فن کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ پنجابی کے دوسرے بڑے شاعر شاہ حسینؒ اسی دور میں ہوئے ہیں۔ وہ بھی موسیقی کے فن سے کماحقہ آگاہ تھے۔ بادشاہ اکبر کے عہد میں موسیقی کے فن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ حسینؒ (1539ء تا 1599ء) جیسا درویش اور صوفی جب اس آیت ''دنیا کھیل تماشے کے علاوہ کچھ نہیں'' کے اندرونی معانی سے شناسا ہوتا ہے تو اُس پر مجذوبی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مسجد سے نکلتا ہے تو موسیقی کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ شاہ حسینؒ پنجابی زبان کے ایسے پہلے صوفی شاعر ہیں جنہوں نے پنجابی شاعری کو کافی کی صنف سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ کافی کو مختلف راگ اور راگنیوں کے سروں میں لکھا۔ اُن سے پہلے راگوں کے بول عام طور پر ہندی میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن شاہ حسینؒ نے راگوں کے بول اور خیال ہندی کی

بجائے پنجابی زبان میں لکھے اور مختلف راگوں میں کافیاں لکھ کر یہ ثابت کر دکھایا کہ پنجابی زبان ان راگوں اور خیالوں کو اپنے اندر سمونے اور بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اُن کے بعد عظیم صوفی شاعر حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے شاہ حسینؒ کے اس فن میں مزید اضافہ کیا۔ نوشہ صاحبؒ کو موسیقی سے رغبت اور محبت تھی۔ آپ کے سوانح سے پتا چلتا ہے کہ آپ کو قوالی سننے کا بے حد شوق تھا۔ ہندال نامی قوال آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور خاص طور پر طویل سفر میں آپ کے ہمراہ ہوتا تھا۔ اسی لئے آج بھی قادریہ سلسلے کی واحد شاخ نوشاہیہ میں سماع کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور بانیٔ سلسلہ کے اس طریق کا بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت نوشہ صاحبؒ موسیقی کی جملہ باریکیوں سے بخوبی آ گاہ تھے اور مختلف راگ اور راگنیوں کا علم رکھتے تھے۔ آپ نے ان راگ راگنیوں میں ہی کافیاں لکھی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ آپ نے راگوں کے بولوں کی زبان ایسی استعمال کی ہے جو آپ کے دور میں عوام کی زبان تھی۔ گنج شریف میں آپ کا کلام مندرجہ ذیل راگوں میں موجود ہے:

1- راگ سارنگ	2- رگ سوہنی یا سوہی
3- راگ تلنگ یا تیلنگی	4- راگ گوجری
5- راگ اساوری	6- راگ کیدارا
7- راگ گوری یا گوڑی	8- راگ رام کلی
9- راگ بلاول	10- راگ بُرج

اب ان راگوں کا حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے کلام سے تعلق ظاہر کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ حضرت نوشہ صاحبؒ اس فن میں کس قدر کمال دسترس رکھتے تھے۔

1- سارنگ ماہرین موسیقی نے سارنگ راگ کو راگ میگھ کی راگنی بتایا ہے۔[1]

1- منشی محمد اکرم، امام خان نائک: معدن الموسیقی لکھنؤ 1925ء ص 168

بعض موسیقاروں نے دعویٰ کیا ہے کہ سارنگ کسی راگ کی راگنی نہیں ہے۔[1] اس کی بارہ اقسام ہیں۔ سِدھ، بندرابنی، بڈہنس، ملرہون، سانونت، دھور یا (دوھولیا)، سورٹھی یا سورنہیر، سجانک، مدھ مات یا مدھ مادھ، گوپر ہاری اور سنہاری۔[2] اس راگنی کی تاثیر یہ ہے کہ اسے سن کر انسان تو ایک طرف جانور بھی حیران پریشان ہو جاتے ہیں اور اُن پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔[3] کامیاب کافی وہی ہوتی ہے جو راگ کے مزاج کے مطابق لکھی گئی ہو۔نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی کے چند مصرعے دیکھئے جو پڑھنے سننے والے پر محویت کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان میں جو سوچ اور احساس پیش کیا گیا ہے اُس کی سچائی بے حد متاثر کرتی ہے:

چھڈ غافل دا سنگ فقیرا، چھڈ غافل دا سنگ[4]
جیں دے ملے کومتیں آون، پوے یاد وچ بھنگ
بے مرشد دی سنگت کھوٹی جیوں کجل دی کوٹھی
سے موڈھ کو لگ کمینے جو غفلت دی پوٹھی
سچیاراں نت باغ بہاراں مرشد سندے رنگ
نوشہ کہے فقیر قادر دا چھڈ غافل دا سنگ

2- سوہنی یا سُوہی اِسے میگھ راگ کی راگنی بتایا جاتا ہے۔[5] سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ دھا۔ نی اس کے سُر ہیں۔[6] جیسے راگ ملہار کی یہ خوبی ہے کہ اُس کے گانے سے بارش برسنے لگتی ہے، اسی طرح سوہی گانے سے بارش بند ہو جاتی

1- حاجی محمد مردان علی خان: غنچہ راگ، نولکشور لکھنؤ 1879ء ص 55
2- ایضاً ص 40
3- معدن الموسیقی ص 110
4- گنج شریف ص 546
5- معدن الموسیقی ص 137
6- ایضاً

ہے۔[1] اس کے گانے کا وقت رات کا پچھلا پہر ہے۔[2] یوں اس راگنی کا تاثر کوچ کا نقارہ بن جاتا ہے کہ رات بیت چکی ہے۔تھوڑی دیر میں دن طلوع ہونے والا ہے۔ رات کا وقت نیک لوگوں کے لئے غنیمت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور گزری ہوئی عمر کو گزری ہوئی رات سے تشبیہہ دیتے ہیں۔اس لئے وہ رات کو ختم ہونے سے قبل اپنے آپ کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ جیون رات گزر چکی ہے۔ ہر انسان اپنی آرام گاہ (یعنی سرائے) میں سے نکل کر پھر اپنے کام کاج کی طرف چل پڑے گا۔ اس لئے جتنی رات باقی ہے اُس میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرلے۔ کیونکہ گزری ہوئی رات پھر ہاتھ نہیں آئے گی۔حضرت نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی دیکھئے جس کے بول مذکورہ مضمون یا خیال کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں:

سن درویش مسافر بھائی ایہہ دنیا پردیس[3]
پردیسی نوں اللہ بیلی جال آئی پردیس
مرشد سچ گزران وسائی گزری ہتھ نہ آوے
ایتھے نت نہ رہنا ہوسی جویں کویں لنگھ جاوے
گھوڑے ہاتھی کوئی نہ ساتھی ، ساتھی نیک کمائی
عملاں دے ونجارے بندے توں کیوں عمر گوائی
ایہہ جیون سفنہ کر جانیں آوے سمجھ تداہیں
جو گزری سو دیکھ پیارے پلک برابر ناہیں
جو گزری سو ہتھ نہ آوے رہندی لیکھے لائیے
کلمہ بھریئے نیکی کریئے صاحب دے گُن گائیے

1- معدن الموسیقی ص110
2- منشی ہادی حسین بنارسی: ترانہ موسیقار سلیمانی پریس بنارس 1927ء ص25
3- گنج شریف ص578,79

مرشد کامل مہر نگاہے مہر نظر کر تارے
نوشہ کہے فقیر قادر دا مرشد جنم سوارے

3- تلنگ پنجاب کے موسیقاروں کا یہ پسندیدہ راگ ہے۔بعض داناؤں نے اسے راگ ہنڈول کی راگنی [1] ،بعض نے میگھ راگ کی راگنی ظاہر کیا ہے اور سمپورن لکھا ہے۔[2] اس کے یہ سُر بتائے ہیں۔سا۔گا۔ما۔پا۔دھا۔نی۔سا[3] اس میں رکھب (رے) کا سُر نہیں ہوتا۔اس راگ کے گانے کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔بعض موسیقار اسے آدھا دن گزرنے یعنی دوپہر کے وقت گاتے ہیں۔بعض اساتذہ نے اس کا وقت دن چڑھنے سے پہلے یعنی سحری بتایا ہے۔[4] اس راگ میں عام طور پر دعا اور التجا کا رنگ اُبھرتا ہے۔نوشہ صاحبؒ کی ایک ایسی ہی کافی دیکھئے جو اس راگ کے مزاج عین مطابق ہے:

مہر تیری من بھالے سائیاں [5]
مہر تیری من بھالے
مہر تیری بن جالن اوکھا ہک پل کوئی نہ جالے
بخشن آویں ڈھل نہ لاویں تیری بخشش دے راہ نرالے
مہر تیری دا ہکو ماسہ لکھ مناں غم ٹالے
نوشہ کہے فقیر قادر دا اے قادر قدرت والے

4- گوجری تلنگ کی مانند اس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ راگ

1- معدن الموسیقی ص135
2- ترانۂ موسیقار ص58
3- معدن الموسیقی ص135
4- ترانۂ موسیقار ص59
5- گنج شریف ص355

ہنڈول یا میگھ کی راگنی ہے۔ اسے سمپورن گایا جاتا ہے۔ اِس کا سرگم یوں ہے۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ ما۔ گا۔ رے۔ یہ راگنی دوپہر، سہ پہر یا صبح صادق اور سویرے کو گائی جاسکتی ہے۔[1] یہ راگنی بیان کیے گئے کسی وقت بھی گائی جائے اُس کا مزاج، اعتماد شکر اور بھروسہ کرنے کا ہے۔ نوشہ گنج بخش کے مجموعہ کلام گنج شریف میں سے ایک کافی دیکھئے جو گوجری راگ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

سچی آس اساسا اساں آس اساسا[2]
سچی آس اساسا
واہ جماعت درویشانی، جنھوں لذت پائی حقانی
مرشد سچے سنگ رلایا کیتا بے وسواسا
سچی آس اساسا
چیتا چِتوں کرامت ہوویں کیوں نہ جوگ سنجوگ دی جوویں
دم دم نال رزق اساڈا اسیں ویکھن آئے تماسا
سچی آس اساسا
سر سر رزق سنبھالے رازق آپے خلقے آپے خالق
نوشہ خاوند ہکو سبھناں کون عام کون خاصا
سچی آس اساسا

5- اساوری معدن الموسیقی کے مصنف کے مطابق اساوری راگ میگھ کی راگنی ہے اور سمپورن گائی جاتی ہے۔ لیکن ترانۂ موسیقار کے مصنف نے اِسے سری راگ کی راگنی لکھا ہے۔ اسی طرح غنچہ راگ کے مصنف نے بھی اسے سری راگ کی راگنی بتایا

1- ترانۂ موسیقار ص 58
2- گنج شریف ص 344

ہے۔[1] جبکہ سنگیت ودیایندی کا خالق اِسے بھیرویں کی ایک راگنی لکھتا ہے۔[2] معدن الموسیقی میں اس کے سر ''سا۔رے۔گا۔ما۔پا۔دھا۔نی'' لکھے ہیں۔[3] اس کے مقابلے میں ترانہ موسیقار میں اس کا سرگم یہ بتایا گیا ہے۔

نی ۔ دھا ۔ سا ۔ ما ۔ پا ۔ گا ۔ دھا ۔ نی

ساماپا ۔ گا ۔ سا ۔ دھا ۔ نی ۔ ما پا[4]

اساوری کی تجسیم یوں بیان کی جاتی ہے ایک ایسی دوشیزہ ، جس نے اپنے قبیلے کا روایتی لباس پہنا ہوا ہے اور محبوب کے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اُس سے ملنے کا انتظار کر رہی ہے۔محبوب کے نہ آنے کی وجہ سے اُداس اور غمگین ہے اور انتظار کی گھڑیاں بیتانے کے لئے اُن سانپوں سے کھیل رہی ہے جو اُس سے ہمدردی جتانے کے لئے وہاں جمع ہوگئے ہیں۔ اساوری ٹھاٹھ کے ساتھ جونپوری ، گندھاری ، کھٹ سندھو، بھیروی، کاؤشیکا، درباری کانڑا، زیلف اور ویشی راگ اور راگنیاں منسوب ہیں۔اساوری کے سارے سر اُترے ہوئے استعمال ہوتے ہیں۔صرف رکھب سُر چڑھا ہوا استعمال ہوتا ہے۔گندھار اور نکھاد اروہی میں استعمال نہیں ہوتے۔[5] اس راگنی کا تاثر سننے والے کو رندانہ سرمستی سے سرشار کرتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نوشہ صاحبؒ اساوری کی گہرائی اور گیرائی سے بخوبی آ گاہ تھے۔ اساوری میں اُن کی لکھی ہوئی ایک کافی کے بول اس امر کا بیّن ثبوت ہیں:

1- غنچہ راگ ص58

2- محمد بخش: سنگیت ودیایندی رشید پبلشرز لاہورس ن ص168

3- معدن الموسیقی ص137

4- ترانہ موسیقار ص42

5- سنگیت ودیایندی ص168

اللہ ولوں ننگ دھڑنگ ، دھڑلے[1]
آپ جنہاں دا رب بھنڈاری لنگر تنہاں دا چلّے
باطن لکھاں لکھ خزانے ظاہر ہتھ نہ پلّے
من پردھان عقل دے روشن دِسن ال وللّے
اندر حق نال رتّے متّے باہر اک اکلّے
بیٹھے ہون سندا بدھ وسن پھردے کملے جھلّے
لوبھ کام کرودھ ہنکاروں موہ نہ اوہناں اُتھلّے
جو اوہ کرن سو اللہ کردا پتھر لال اُگلّے
نوشہ کہے فقیر اللہ دا سب اللہ دے تجلّے

6- کیدارا اسے کیداری بھی کہا جاتا ہے۔بعض اساتذہ نے اِسے سری راگ کی راگنی لکھا ہے۔[2] لیکن زیادہ داناؤں کا خیال ہے کہ یہ دیپک راگ کی راگنی ہے۔[3] اس کا سرگم ، سا۔ گا۔ ما۔ پا۔ ہے۔[4] اس کے گانے کا وقت نصف رات ہے۔[5] اسکی ترکیب بلاول ،پوربی اور ککیہ ہے۔ اسکی مزید پانچ قسمیں ہیں۔ سدھ کیدارا ، سیام کیدارا، نٹ کیدارا، مکتا کیدارا اور مارو کیدارا[6] اُس کا تاثر متین ، نرم اور عجز والا ہے۔ نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی کے یہ بول کیدارا کے مزاج کی خوبصورت

1- گنج شریف ص309
2- معدن الموسیقی ص168
3- ترانۂ موسیقار ص53 ۔غنچہ راگ ص38
4- معدن الموسیقی ص168
5- ایضاً
6- غنچہ راگ ص38

نمائندگی کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

خود ہی نور خدا خاوند خود ہی نور خدائے [1]
عاجزی درکار او تھے خودی کم نہ آئے
بندگی کر بندیا لے پاک نام خدائے

7- گوری (گوڑی) ترانہ موسیقار، معدن الموسیقی اور غنچہ راگ میں اسے مالکونس کی راگنی بتایا ہے۔ یہ راگنی دن کے پچھلے پہر یا رات کے پہلے پہر میں گائی جاتی ہے۔ ترکیب، گوجری، جے جے ونتی، اساوری اور سورٹھ کیساتھ ملتی ہے۔[2] گوری کی دو مشہور قسمیں سدھ گوری اور چیتی گوری ہیں۔[3] اس کے تاثر میں حقیقت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی کا یہ مکھڑا دیکھئے۔

درویشی اخلاص پیارے درویشی اخلاص [4]
میں میں چھوڑے مانا توڑے سوئی بندہ خاص
میری میری کوڑ دی ڈھیری کوڑوں لکھ و ناس
ہکو رنگ سدا درویشاں طمع نہ کجھ ہراس

آپ کی ایک اور کافی کا مکھڑا دیکھئے:

بندے ایہہ جگ بندی خانہ [5]
ایتھے آکے سُکھ نہ پایا، سُکھ بھالے دیوانہ

ایک اور کافی کے شروع کے بول یوں ہیں:

1- گنج شریف ص 527
2- غنچہ راگ ص 30
3- ایضاً
4- گنج شریف ص 332
5- ایضاً ص 414

بندے کر لے یاد الٰہی
جس تھوں شاہ پت شاہ اکھاون ۔تس دی سچی بادشاہی [1]

8- رام کلی یہ راگ ہنڈول کی راگنی اوڈھو ہے۔[2] یہ رات کے آخری پہر یا صبح سویرے گائی جاتی ہے۔[3] بندھن یہ ہے۔سا۔رے۔گا۔ما۔پا۔دھا۔نی۔[4] رام کلی (دھرپد) چوتال تین قسم کی ہوتی ہے۔[5] گنج شریف میں نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی اس راگنی میں موجود ہے۔جس کا مکھڑا یوں ہے:

درویشی دا خیر دے داتا درویشی دا خیر [6]

وحدت وچ بسیرا ہووے اٹھ جاوے من تھوں غیر

9- بلاول اسے برادر برادری یا بلاول بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہنڈول کی ایک راگنی ہے۔[7] اس کا سرگم ،سا۔رے۔گا۔ما۔پا۔ ہے۔[8] یہ راگنی دن طلوع ہونے کے سمے گائی جاتی ہے۔اسکی چودہ اقسام ہیں۔[9]

1- سدھ بلاول 2- گلب بلاول 3- ایسا بلاول 4- سکل بلاول
5- کمانچی بلاول 6- جے جے ونتی 7- سنکر بلاول 8- کجیلی بلاول
9- ایمن بلاول 10- کامودی بلاول 11- مدھر رسیا بلاول 12- سکیا بلاول
13- بھاگ بلاول 14- سوہا بلاول

1- گنج شریف ص 474
2- معدن الموسیقی ص 134
3- ترانہ موسیقار ص 30
4- ایضاً ص 50
5- ٹھاکر نواب علی خاں: معارف النغمات؛ حصہ دوم ادارہ فروغ فن لاہور 1977ء ص 114
6- گنج شریف ص 534
7- ترانہ، موسیقار ص 49
8- ایضاً ص 52
9- غنچہ راگ ص 36

اس میں خوشی کا تاثر ملتا ہے۔نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی راگ بلاول میں ہے جس کے بول ہیں۔

مرشد ملے سو تریا پیارے مرشد ملے سو تریا[1]
من وحدت سنگ بھریا
مرشد سچے مہر نگاہے کاٹھاں کیتا ہریا
مہرنظر کر سچے مرشد سکھیاں نوں بھریا
نوشہ کہے فقیر قادر دا فقروں جنم سدھریا

10- برج یہ راگ سمپورن ہے اور خاص طور پر پوربی ٹھاٹھ میں گایا جاتا ہے۔مزاج کے اعتبار سے شوخ ہے۔رات کے پچھلے پہر میں گایا جاتا ہے۔اس کے سُر، سا نی سا ۔ را سا نی دھا۔ سانی دھا پا۔ می گی دھا می۔ گی را سا۔ ہیں۔[2] نوشہ صاحبؒ کی ایک کافی کے چار مصرعے دیکھئے جو برج راگ کے مزاج سے میل کھاتے ہیں:

سائیں ہک سبھسے تائیں بھل نہ جائیں پیاریا[3]
سب دا داتا ہکو جاتا ، سبھسے سائیں تاریا
روپ اروپ سروپا ہو ہو سبھنیں تھائیں دھاریا
نوشہ مرشد بھیت سمجھایا گو روگو سائیں واریا

اس جملہ تجزے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ نوشہ صاحبؒ نہ صرف بلند مرتبہ صوفی شاعر تھے۔ بلکہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کے علم سے بھی کماحقہ واقف تھے۔انہوں نے منفرد سوچ اور فنی مہارت کی بنا پر مختلف راگوں میں میں پنجابی

1- گنج شریف ص 306
2- معارف النغمات حصہ دوم ص 361
3- گنج شریف ص 148

کافیاں لکھ کر ثابت کر دیا کہ پنجابی زبان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو راگ کے خیال جا مکھڑے کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لئے زبان اور موسیقی پر عبور حاصل ہونا شرط ہے۔ یہ تمام خوبیاں ہمیں نوشہ صاحبؒ کے ہم عصر شعراء کے ہاں خال خال نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نوشہ صاحبؒ سے لے کر خواجہ غلام فریدؒ تک کوئی شاعر موسیقی کے حوالے سے اپنے پنجابی کلام وہ کمال پیدا نہیں کر سکا جو نوشہ صاحبؒ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ البتہ نوشہ صاحبؒ کے بعد بُلھے شاہ یا پھر تین صدیوں بعد خواجہ غلام فرید کی بعض کافیوں میں یہ خوبی دکھائی دیتی ہے۔

المختصر یہ کہ حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے پنجابی ادب میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ انہوں نے پنجابی کلام کے ذریعے شاہ جہانی دور کی پنجابی زبان کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ کلام میں نادر اور مقامی تشبیہات، عوامی آکھان اور محاورے جہاں نوشہ صاحبؒ کے سماجی و تہذیبی شعور کو ظاہر کرتے ہیں وہاں اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ فطری رشتے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہئیت اور نئی اصطلاحات کے حوالے سے بھی نوشہ صاحبؒ نے کئی ایک نئے تجربات کئے ہیں۔ خاص طور پر اٹ، مانجھ اور غزل جیسی اصناف سخن کو انہوں نے متعارف کرایا۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے استعمال سے پنجابی زبان کو لسانی اعتبار سے جو وسعت بخشی ہے وہ بے حد قابل ستائش ہے۔ نوشہ صاحبؒ کا کلام عوام کے سامنے آنے سے پنجابی ادب کے کئی ایک گوشے روشن ہوئے ہیں۔ اغلب ہے کہ آپ کے یہ کارنامے آنے والے دور میں تحقیق کی نئی راہیں کھول دیں۔ عربی بحروں میں پنجابی شعر کہنا، زبان میں سادگی، بھرپور تاثر، جوش شگفتگی، اور روانی جیسی خوبیاں اُن کے کلام کو منفرد بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نوشہ گنج بخشؒ قادریہ سلسلے کے بزرگوں میں اعلیٰ، ارفع اور منفرد مقام رکھتے ہیں اسی طرح وہ پنجابی ادب میں بھی اعلیٰ و ارفع اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔